فارم ۱۷
دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	....
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام وپتہ مالک رسالہ	

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۹۳ ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۴ء عدد ۴

مضامین

شذرات

اس مرتبہ جس شکل میں اور جیسے مسلسل فسادات ہو رہے ہیں، وہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ کوئی ہنگامی واقعہ نہیں بلکہ ایک مرتب و منظم اسکیم کا نتیجہ ہیں جو مسلمانوں اور حکومت دونوں کیلئے یکساں خطرناک ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ یا حکومت فرقہ پرستوں کے سامنے سپر ڈالدے یا اس کا تختہ الٹ کر اس کو اپنے قالب میں ڈھالا جائے، اب فسادات نے ایک انقلابی اور وسیع و منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے، اور فرقہ پروری کا زہر پورے ہندوستان میں سرایت کر چکا ہے جس سے کانگریس اور حکومت کے ارکان تک کا دامن پاک نہیں ہے، وہ حکام جن پر امن و امان کے قیام کا دار و مدار ہے خصوصیت کے ساتھ اس کا شکار ہیں، اس لئے حکومت فرقہ پروروں کے خلاف کوئی کوئی سخت قدم نہیں اٹھا سکتی، اگر وہ اسکی ہمت کرے بھی تو اُس میں کامیاب نہ ہوگی،

………

ان فسادات کو روکنے کی صرف یہی شکل ہے کہ پہلے کانگریسی اور حکومت کے ارکان خود اپنا ذہن صاف کریں، اور ایسے بیانات نہ دیں جن سے فرقہ پرستوں کو شہ ملتی ہو، ان کے اخبارات، لیڈروں اور جارح تنظیموں پر پابندیاں عائد کی جائیں، اُن میں سے جو بھی فرقہ پروری کو بھڑکائے، اس سے سختی کیساتھ مواخذہ کیا جائے، یہ عذر لغو ہے، کہ زبان اور قلم پر پابندی عائد کرنا جمہوریت کے خلاف ہے، جب ان کو جمہوریت کو ختم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے، اس وقت اُن کی آزادی کو قائم رکھنا جمہوریت نہیں، بلکہ جمہوریت دشمنی ہے، جو حکام فسادات میں فرقہ پروری سے کام لیں اُن کو سخت سزائیں دی جائیں، فوج اور پولیس میں مسلمانوں کو ان کے تناسب سے جگہیں دی جائیں،

کانگریس پوری قوت اور تنظیم کیساتھ پورے ملک میں فرقہ پرستی کے خلاف تحریک چلائے اور جس طرح وہ آزادی کی جنگ لڑی تھی، اسی ہمت و جرأت سے فرقہ پروری کا مقابلہ کرے، اگر اس میں حکومت ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہو، تو اس کی بھی پروا نہ کرے، اس کے بغیر اس طوفان کا روکنا ناممکن ہے، دوسرے ذرائع سے ممکن ہے فسادات عارضی طریقہ سے دب جائیں لیکن جب تک فرقہ پرستی کی جڑ نہ اکھڑے گی، اس وقت تک فسادات کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، اس میں شبہہ نہیں کہ فرقہ پرستوں کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے اور ان کا اثر اتنا ہمہ گیر ہو چکا ہے کہ ان باتوں پر عمل کرنا بہت دشوار ہے، لیکن ان حالات میں بھی ہندوستان سے انسانیت کا چراغ بجھ نہیں گیا ہے، اور اب بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے، جو دل سے فرقہ پروری کا استیصال چاہتا ہے، اگر وہ ہمت کر کے میدان میں نکل آئے تو کامیابی بالآخر اسی کو ہوگی، اس لئے کہ فرقہ پروروں کی بنیاد تخریب، نفرت اور دشمنی پر ہے، اس لئے وہ تعمیری اور اصلاحی جماعتوں کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اور دیر سویر ان کو ان کے مقابلہ میں شکست ماننا پڑیگی، اور اگر یہ صورت نہ اختیار کی گئی، تو حکومت کو یا فرقہ پرستوں سے سمجھوتہ کرنا، یا اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے گا، دونوں صورتوں میں اس کا خاتمہ ہے،

حکومت کی کمزوری اور عارضی مصلحتوں نے اس کو حقائق سے غافل کر دیا ہے، فرقہ پرستوں کا اصل مقصد حکومت پر قبضہ کر کے اس کو اپنے قالب میں ڈھالنا ہے، مسلمانوں کی دشمنی کو انھوں نے اس مقصد کے حصول کا وسیلہ بنایا ہے، اس لئے اگر وہ غالب آ گئے تو کانگریس کو نہ صرف حکومت سے ہاتھ دھونا پڑیگا، بلکہ اس کے ساتھ ہندوستان سے جمہوریت اور سیکولرزم کا بھی خاتمہ یقینی ہے، اور اس نے اس کے ذریعہ دنیا میں جو وقار حاصل کیا ہے وہ خاک میں ملجائیگا، اور فرقہ پرستی کی آگ محض مسلمانوں کی دشمنی تک محدود نہ رہے گی، بلکہ آگے چل کر اس سے اور بھی فرقہ بندیاں پیدا ہوں گی، جو ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیگی، اسلئے فرقہ پرستی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کے تحفظ کا نہیں بلکہ خود جمہوریت اور سیکولرزم کے تحفظ کا ہے، اسلئے یا حکومت کو کھل کر فرقہ پروری کا مقابلہ کرنا یا اپنے اصولوں کو خیرباد کہنا پڑیگا، دونوں چیزیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں، یہی توقع پاکستان سے بھی ہے، خدا ان دونوں کو اپنی اپنی اقلیتوں کی ذمہ داری محسوس کرنے کی توفیق دے،

دارالمصنفین نصف صدی سے جو علمی خدمت انجام دے رہا ہے اس نے جس طرح ملک کا مذاق بنایا، اور جیسا سنجیدہ اور وسیع علمی لٹریچر پیدا کیا، اس سے علمی حلقہ پوری طرح واقف ہے، اسلئے اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں، اس طویل مدت میں اس نے اپنے اشتہار کا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا، اور خاموشی کیساتھ اپنا کام انجام دیتا رہا، جس کی اہل علم نے پوری قدر دانی کی، دارالمصنفین اس حیثیت سے پورے ہندستان میں منفرد ادارہ ہے، کہ اس کا اپنا وسیع کتبخانہ ہے، اپنا برقی پریس ہے، اپنے مستقل رفقار و مصنفین ہیں، جو دارالمصنفین میں رہ کر کام انجام دیتے ہیں، یعنی ایک علمی ادارے کیلئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب دارالمصنفین میں موجود ہیں، اس کو کسی چیز کیلئے باہر کی ضرورت نہیں، اور یہ ساری چیزیں اس نے حکومت کی سرپرستی اور قوم کی امداد کے بغیر فراہم کیں، نہ اس نے انگریزوں کے زمانہ میں کوئی امداد لی، اور نہ قومی حکومت نے بعض عارضی امدادوں کے علاوہ جو خاص کام کے لئے تھیں کوئی مستقل امداد دی، نہ اس نے قوم کے سامنے کبھی ہاتھ پھیلایا، دارالمصنفین کے کارکنوں نے جس قناعت اور سادگی کے ساتھ پوری عمر گذار دی، اس کا تصور بھی اس زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا،

اب ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات نے اس قسم کے اداروں کی اہمیت بہت گھٹا دی ہے، لیکن بعض پہلوؤں سے اس کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کے سامنے دارالمصنفین کے خدمات پیش کر کے اسکی اہمیت واضح کیجائے، اور ان طبقوں میں بھی اسکی آواز پہنچائی جائے جو اس سے کم واقف ہیں، اس لئے اگر حالات سازگار رہے تو انشاء اللہ آیندہ نومبر میں اس کی پچاس سالہ جوبلی کرنے کا ارادہ ہے، نائب صدر جمہوریہ عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے جن کے دارالمصنفین سے دیرینہ تعلقات ہیں، اور جو اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی ہیں، اس کی صدارت منظور فرمائی ہے، امید ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومت کے علم دوست وزراء، اسلامی حکومتوں کے سفراء، یونیورسٹیوں اور عربی درسگاہوں کے فضلا، اور ہندوستان کے نامور علماء و مشاہیر اس تقریب میں شریک ہوں گے، اور علمی حیثیت سے اس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کیجائے گی

مقالات

علامہ سید سلیمان کی نثر و انشاء

از جناب سید ذو الفقار حسین بخاری ایم، اے، لکچرار اسلامیہ کالج لائل پور

جن اصحاب علم و قلم نے لیلائے اردو کے گیسوؤں کو سنوارا اور اس کو ایک علمی و ادبی زبان بنایا اُن میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک ممتاز مقام ہے، وہ اسلامی علوم کے فاضل اجل ہی نہیں، ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے، اور مختلف مرحلوں سے گذرنے کے بعد اس منزل پر پہنچے تھے، اس مضمون میں ان مراحل اور ان کے مخصوص طرز کا جائزہ لیا گیا ہے، (م)

سید صاحب کا طرز تحریر مختلف اوقات میں بدلتا رہا ہے، سید صاحب نے ابتدا میں مولانا شرر کی "منصور موہنا" پڑھی تھی، اس کے مطالعہ سے انھیں شرر کا طرز تحریر بہت پسند آیا، اور اسی سے اُن کی تحریر کی ابتدا ہوئی، چنانچہ ۱۹۰۴ء میں الندوہ لکھنو کے لیے انھوں نے دو مضامین "علم حدیث" اور "منطق" پر اسی رنگ میں لکھے، اسی زمانے میں مولانا شبلی ندوۃ العلماء میں آئے، انھوں نے یہ مضامین دیکھے اور بقول سید صاحب :-

"پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دیکر باقی رکھا، اور دوسرے کو جس میں شرریت زیادہ تھی نکال ڈالا" ("میں جن سے متاثر ہوا" معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۸)

اس لیے سید صاحب نے مولانا شبلی کے رنگ کی پیروی شروع کر دی، مگر بقول ان کے:

"اصل منزل تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی، کیونکہ ابھی رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۹۰۷ء میں "سخندان پارس" کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا ایک دو مضمون اس رنگ میں لکھے۔" (معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۸)

مگر اس طرز کا نباہنا ان کے بس میں نہ تھا، اس لیے پھر شبلی کی طرز تحریر کی طرف مائل ہوئے، جو علمی مضامین کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔

"اس لیے ان کی ایک ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی اور سالہا سال ان کی صحبت اٹھائی، تو علمی زندگی کا ایک نہج، تقریر کا ایک انداز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا۔" (معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۹)

لیکن ابھی سید صاحب نہ شبلی کے طرز کو اپنا سکے اور نہ اپنا انفرادی اسلوب پیدا کر سکے تھے، کہ جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں "الہلال" نکلا تو سید صاحب اس کے اسٹاف میں شامل ہو گئے، اور الہلال کے مضامین میں یکسانیت قائم رکھنے کے لیے مولانا ابوالکلام کے مقبول عام خطیبانہ طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ اس زمانے کی اکثر و بیشتر تحریریں الہلالی رنگ میں ہیں، اس طرز کا کامیاب ترین مضمون مسجد کانپور کے بارے میں "مشہد اکبر" ہے[1]۔ لیکن ابوالکلام کا رنگ بھی عارضی ثابت ہوا، اور سید صاحب پھر ایک بار استاد کے نقش قدم پر آگئے، فرماتے ہیں:-

---

[1] "مشہد اکبر" ابوالکلامی رنگ میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ ناواقف لوگ اس کو مولانا ابوالکلام آزاد کی نگارش کا نتیجہ سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ مضمون سید صاحب ہی کا ہے، ہم نے اس پر ایک مضمون میں مفصل بحث کی ہے، جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کا کوئی ایسا بیان نہیں ہے جس میں انھوں نے اس مضمون کو اپنی ملکیت بتایا ہو، اس کے برعکس سید صاحب کا صریح بیان موجود ہے کہ یہ مضمون ان کا ہے۔ یہاں یہ بات کہہ دینا ضروری ہے کہ مولانا ابوالکلام اپنے طرز خاص کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی، ان کی

(باقی ص پر)

"معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں، اس کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا، لیکن معارف میں آکر ہلالیت کم ہو کر ایک اور خاص رنگ ابھر آیا، لیکن بہرحال چند روز ادھر ادھر بہک کر پھر اسی راستہ پر آگیا جس پر استاد مرحوم نے لا کر کھڑا کر دیا تھا، خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کے طرز ادا کے نباہنے کی پوری کوشش کی ہے۔" (معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۹)

آخرکار انھوں نے شبلی ہی کے طرز میں اپنی تحریروں کو ڈھالا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی تحریروں سے ابوالکلام کے طرز کا اثر پوری طرح مٹ نہ سکا، ان کی آخری زمانے کی تحریروں تک میں کسی نہ کسی حد تک یہ اثر موجود ہے، اس سے پہلے کہ سید صاحب کے اسلوب خاص پر گفتگو کی جائے، مولانا شبلی کے طرز ادا، مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب بیان پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ان کی روشنی میں سید صاحب کے طرز خاص کا تجزیہ کیا جائے گا۔

ہر تحریر اپنے لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے، بفن (Buffon) کا قول ہے "Style is the man"[1]۔ لیکن بعض اوقات لکھنے والوں میں دوسرے مصنفین کے اسالیب کی بھی جھلک آجاتی ہے، اس کے علاوہ لکھنے والے کی ذات (خواہ وہ اسے دبانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے) اپنے کو ظاہر کر دیتی ہے، بقول ڈوبرے ہر مصنف کی ذاتی

(بقیہ حاشیہ ص   ) تقلید کوئی آسان کام نہیں، سید صاحب کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے ابوالکلام کے رنگ میں اس قدر ڈوب کر لکھا کہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا یہ تحریر سید صاحب کی ہے یا ابوالکلام کی، اسی طرح شرر اور محمد حسین آزاد کی تحریروں کی پیروی کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ سید صاحب جس طرز سے متاثر ہوتے تھے، اسی میں لکھنے کی استعداد پیدا کر لیتے تھے۔

[1] The problem of style by Murrey p-3 ص ۳

آواز کا لہجہ بھی سنائی دے ہی جاتا ہے[1]، اور لکھنے والا چاہے کتنے ہی دوسروں کے اسالیب کی خارجی شکل (External form) کو اختیار اور اس کی تقلید کرنے کی کوشش کرے لیکن اس کی اپنی شخصیت کہیں نہ کہیں ضرور ظاہر ہو کر رہتی ہے، یہی حال سید صاحب کا ہے، انھوں نے دوسرے مصنفین کا انداز بیان اپنانے کی کوشش کی، لیکن ان مصنفین اور سید صاحب کے مزاج میں بڑا فرق تھا، اس لیے یہ فرق ان کی تحریروں میں بھی جھلکے بغیر نہیں رہا،

شبلی بڑے جذباتی تھے، وہ راجپوت تھے، ان میں اسلام کی خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا، اس لیے ان کی تحریروں میں قوت اور جوش بیان ہے، انھیں اپنے کمال اور اپنی عظمت کا احساس بھی تھا، اس لیے ان کا قلم فخر و مباہات کے واقعات میں زیادہ جولانی دکھاتا ہے، شبلی کی شخصیت نے ان کی تحریر کو بعض نمایاں خصوصیات عطا کی ہیں، ان کے احساس عظمت نے خاص طرح کے ذخیرۂ الفاظ ان کے قلم پر چڑھا دیے تھے، مثلاً وہ فخر و افتخار، شباب، ہستی، نشہ، شراب، انجمن، بہار، رنگ، داستان وغیرہ، الفاظ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں[2]، ان کے مزاج میں شاعری کا رنگ رچا ہوا تھا، اس لیے تشبیہ و استعارے کو زیادہ کام میں لاتے ہیں، اور نثر میں بھی شاعرانہ فضا قائم کر دیتے ہیں، شبلی کی تحریر میں استدلالیت بھی ہے اور سادگی بھی، مگر وہ سپاٹ نہیں ہوتی، وہ طنز و تعریض سے بھی بڑا کام لیتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ طنز کا رنگ زیادہ تیز ہوتا چلا گیا، طنزیاتی جملے ان کی سب کتابوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں، ان کے طنز کا سب سے زیادہ موثر اور کامیاب رخ "یورپ کے بے درد

۱؎ The modern prose style by Dobree. P.3

۲؎ محترمی ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اپنے مقالہ "شبلی کا اسلوب بیان" میں اس طرح کے بہت سے الفاظ کی فہرست دی ہے، ملاحظہ ہو "بحث و نظر" ص ۱۳۵ تا ۱۴۵

مورخین اسلام" کے خلاف ہے، اس کا دوسرا نشانہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور ہمعصر علماء و فضلاء ہیں، شبلی کے اسلوب کا تیسرا نمایاں پہلو ان کی خطابت ہے، ایسے موقعوں پر وہ "تم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، شبلی کی جوشیلی طبیعت کے اس پہلو نے ان کی مورخانہ حیثیت کو نقصان بھی پہنچایا لیکن ان کی مورخانہ حیثیت ان کے مورخانہ کمال سے زیادہ ان کے اسلوب کی دلکشی کی وجہ سے بلند مقام رکھتی ہے،

شبلی کی خطابت کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اختیار کیا، اور جذبات کی تندی و تیزی میں ان سے بھی آگے نکل گئے، وہ ایک شعلہ بیان خطیب اور آتش نوا سیاسی لیڈر تھے، جنگ بلقان، طرابلس اور تحریک خلافت کے زمانے میں ان کی شخصیت اپنے عروج پر تھی، شبلی اور آزاد کے مزاج کا یہ اشتراک سید صاحب کے اسلوب پر کئی طرح سے اثر انداز ہوا، وہ شبلی سے زیادہ صیغۂ واحد متکلم[1] کا استعمال کرنے لگے، "الہلال" اور "البلاغ" میں مولانا آزاد پر یہی رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح فارسی عربی کی بڑی بڑی ترکیبوں کی کثرت بھی شبلی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں، جس سے بعض اوقات قاری کو بڑی الجھن ہوتی ہے، الہلال، البلاغ اور تذکرہ میں آزاد کی تحریر کا یہی عالم ہے، بلکہ ان کے فقروں میں طوالت اور جملہ ہائے معترضہ کی کثرت بھی بہت ہے، جس سے آزاد کا رنگ شبلی کے رنگ سے الگ ہو جاتا ہے، یہاں وہ بعض اوقات شبلی کے بجائے ابوالفضل کا رنگ اپنانے لگتے ہیں، آزاد کی طبیعت طوالت کی طرف مائل ہے اور شبلی ایجاز و اختصار کے قائل تھے[2]، اس رجحان کی وجہ سے آزاد کی تحریر میں مبالغہ، فخر و مباہات

۱؎ مولانا ابوالکلام آزاد کے صیغۂ واحد متکلم یعنی "میں" میں جو کشش اور رعنائی ہے وہ کسی دوسری اور غیر زمانی ادیب کے "میں" میں نہ پیدا ہو سکی، ۲؎ سید صاحب مولانا شبلی کا یہ قول سنایا کرتے تھے کہ "میں ایجاز کا بادشاہ ہوں اور ابوالکلام اطناب کا بادشاہ ہے"، بروایت سید صباح الدین عبدالرحمن: مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں"

(معارف جون ۵۸ء ص ۴۱۳)

احساس کمال اور طنز و استہزا کا رنگ بہت شوخ ہوگیا ہے، اور ان کی تحریر شبلی سے الگ ہوگئی ہے، "غبار خاطر" میں آزاد کی تحریر کا گھن گرج کم ہوجاتا ہے، اور اعتدال آجاتا ہے،

سید سلیمان ندوی کا مزاج تاریخی، تحقیقی اور علمی تھا، انھیں ہنگامہ خیز واقعات سے بہت کم دلچسپی تھی، ان کی شخصیت میں ایک سکون، وقار اور خلوص تھا، یہی اوصاف انکی تحریروں میں ظاہر ہوئے، انھوں نے شبلی کا اسلوب اختیار کیا لیکن بقول ڈو برے (۵۵ ص ۶۵) اپنا اسلوب بھلا کہاں چھپ سکتا ہے، سید صاحب کی تحریروں میں شبلی کا اسلوب محض خارجی اور اختیاری وصف کے طور پر آگیا ہے لیکن ان کے مزاج میں جوش و خروش کے بجائے ٹھہراؤ ہے، اس لیے شبلی کا اسلوب ان سے نبھ نہیں سکا، گو سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ شبلی کے کامیاب مقلد ہیں، لیکن نقادوں کو ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے،

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں:۔

"سید صاحب کی تحریر میں شبلی کی برجستگی و بے ساختگی اور فارسی تراکیب کی چستی نہیں۔" (قومی آواز لکھنؤ، ۳۰ نومبر ۵۳ء)

مولانا عبد الماجد دریابادی تحریر فرماتے ہیں:۔

"سلیمانی ادب و انشا، کا جو اردو کی تاریخ ادب و انشا، میں ایک خاص مقام ہے شبلیت اور ابو الکلامیت دونوں سے الگ ایک خوشگوار حد تک دونوں کو سموئے ہوئے ہے۔" ("صدق جدید" لکھنؤ ۲۲ جنوری ۵۴ء)

اس سے انکار نہیں کہ سید صاحب نے شبلی اور آزاد دونوں کے اسالیب کو اپنانے کی کوشش کی لیکن ان کے طبائع میں بنیادی اختلاف ہے، اس لیے ان کے اسلوب سید صاحب کے اپنے اسلوب کا جز نہ بن سکے،

سید صاحب نے شبلی کی تحریر کے دو پہلوؤں سے زیادہ اثر لیا ہے: (۱) فارسی کی شگفتہ

تراکیب کا استعمال (۲) طنز۔

سید صاحب کے ہاں فارسی ترکیبوں کا استعمال خاصا ہے، لیکن عربیت کی طرف میلان کی وجہ سے ان کی تحریر کا عام رنگ شبلی سے کچھ مختلف ہوگیا ہے، تاہم شبلی کی محبوب ترکیبیں، سید سلیمان ندوی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں، طنز سید صاحب کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں اور ان کی عام کتابوں میں ان کا استعمال بھی زیادہ نہیں ہے، لیکن معارف کے شذرات میں اور بعض جوابی تحریروں میں یہ رنگ ضرور ظاہر ہوا ہے، دو شذرات ملاحظہ ہوں:۔

"ابتک جمہوریت کا نشانہ، کانفرنس، لیگ، یونیورسٹی وغیرہ قومی مجالس تھیں اور ہم خوش تھے کہ خیر دنیا کے دیگر طبقات کسی حال میں ہوں لیکن ہم مصنفین اور ارباب قلم کا رقبہ حکومت تو اس خیرہ سری سے پاک ہے، لیکن ہم کو اپنے حسن ظن میں کس قدر ناکامی ہوئی جب ہم نے گذشتہ ہفتوں میں نواب وقار الملک مرحوم کی ترتیب سوانح کے لیے بعض اخبارات میں ایک مجلس شوریٰ کی تجویز پڑھی جس میں چند ملک کے مسلم تعلیمی و سیاسی اصحاب کے نام درج تھے، کہ باہم مشورہ سے وہ اس عظیم الشان قومی کارنامے کو انجام دیں۔" (معارف جولائی ۱۹۱۷ء)

دوسرا شذرہ:۔

"علی گڑھ کی سب سے نمایاں جگہ یعنی صدر نشین کی نشست گاہ کے اوپر کسی خوش مذاق شاعر کا جلی حرفوں میں کپڑے پر لکھ کر یہ شعر آویزاں کیا گیا تھا۔

وفا شعاری و حب الوطنی و دیں پرستی کی علامت
کہ اپنے قومی نشاں میں تاج اور کھجور اور ہلال بھی ہے

یہ صحیح و صحیح شعر جس کے موزوں پڑھنے میں متعدد باکمال شاعروں کو کافی زحمت اٹھانی

پڑی، دراصل علی گڑھ کی اصلی اور اندرونی ذہنیت تھی، جو اس کے ذرہ ذرہ سے نمایاں تھی، منتظمین کار کو داد دینی چاہیے کہ انھوں نے علی گڑھ کا دل نکال کر سب کے سامنے رکھدیا تھا۔" (معارف جنوری ۱۹۲۷ء)

جوابی تحریروں میں اکثر لطیف طنز ہوتا ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔ پروفیسر مارگولیتھ نے واقدی کے حوالہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر چند ناگوار اعتراضات کیے ہیں، سید صاحب گے واقدی کی صحیح حیثیت متعین کرتے ہوئے جوابی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ناظرین غور کریں، بات کہاں سے کہاں گئی، واقدی تو نیند کا ذکر کرتا ہے، ولہاؤسن اس ترجمہ غشی کرتے ہیں، مارگولیتھ ڈر سے غش کھا کر گر جانا (Fainted) اس سے مطلب نکالتے ہیں، کیا یورپین مستشرقانہ تحریف کی اس سے بہتر کوئی مثال ہو سکتی ہے؟" (آگے عربی عبارت دے کر اس پر روشنی ڈالتے ہیں، اسکے بعد لکھتے ہیں):

"کیا مستشرقانہ ژرف نگاہی کی اس سے اور زیادہ بہتر کوئی دلیل چاہیے؟ کیا علمائے یورپ کے ناطرفدارانہ مطالعہ مشرقیات کی سب سے اچھی مثال نہیں؟ اور آکسفورڈ کے عربی پروفیسر کے تبحر اور فضل اور بے تعصبی کی عمدہ نمایش نہیں؟"[۱]

شبلی اپنی تحریروں میں اکثر اشعار لاتے ہیں، سید صاحب کو یہ طرز پسند نہیں، اس لیے ان کے ہاں اشعار کی وہ کثرت نہیں جو شبلی یا آزاد کے ہاں پائی جاتی ہے، سید صاحب کی اکثر کتابیں اشعار سے خالی ہیں، سیرت کی کتابوں میں نعتیہ اشعار کا عام رواج رہا ہے، کیونکہ جذبات کی شدت کے موقع پر اکثر اشعار قلم اور زبان پر آجاتے ہیں، مگر سید صاحب نے ایسے موقعوں پر بھی

[۱] محمد بن عمر و واقدی، معارف جنوری ۱۹۲۷ء ص ۲۲ - ۲۳

عموماً اشعار کا استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے، چنانچہ سیرۃ النبی کی چاروں جلدوں میں تیسری جلد کے شروع میں صرف ایک شعر اور درمیان میں مولانا روم کے چند اشعار، دعوی کے ثبوت کے طور پر لکھے ہیں چوتھی اور پانچویں جلدوں کے صرف دیباچوں میں چند اشعار ہیں، جلد پنجم میں درمیان میں ایک شعر (ص ۲۹۱) پر ہے، "عربوں کی جہازرانی"، "عرب وہند کے تعلقات"، "خیام"، "سیرت عائشہؓ" اور "رحمت عالم" اشعار سے بالکل خالی ہیں، "خطبات مدراس" میں صرف تین شعر اور تین مصرعے ہیں، آخری تصنیف "حیات شبلی" میں بھی چند اشعار نظر آتے ہیں، اس کا سبب[۱] شاید یہ ہو کہ وہ استاد کی سوانح عمری لکھتے وقت استاد کے محبوب رجحانات سے زیادہ متاثر ہو گئے تھے،

سید صاحب کی مندرجہ ذیل کتابوں میں شبلی کا اثر زیادہ ہے:۔

(۱) سیرۃ النبی (۲) نقوش سلیمانی کے بعض خطبات (۳) حیات شبلی،

مندرجۂ ذیل چیزوں میں ابوالکلام کا اسلوب غالب نظر آتا ہے:

(۱) معارف کے ابتدائی چند سالوں کے شذرات (۲) متفرق مقالات (۳) ارض القرآن (ج ۱)

(۴) حیات شبلی میں بھی معمولی سا اثر ہے،

مئی ۱۹۱۳ء سے لیکر اکتوبر ۱۹۱۳ء تک جب سید صاحب "الہلال" کے شعبۂ ادارت میں شامل تھے، ان کی تحریروں میں ابوالکلام کا اثر زیادہ نظر آتا ہے، جس کو انھوں نے بعد میں ترک کردیا تھا، پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا، مثلاً معارف کا یہ شذرہ دیکھئے:

"ذرا ٹھہریے اور ایک لمحہ غور کیجئے! یہ غلط کاری سر منزل نہیں بلکہ سر راہ واقع ہوئی ہے، فتنۂ غدر کے بعد جب ہم نے آنکھیں کھولیں تو ایک ایسے رہنما کو اپنے قافلہ کا رہبر پایا جو مذہب تعلیم اور سیاست

[۱] ہمارے نزدیک اسکی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مولانا تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں آنے کے بعد سید صاحب اپنے خطوط میں کبھی کبھی اشعار کا استعمال کرنے لگے تھے، بیعت کے بعد حیات شبلی پہلی اور آخری تصنیف ہے اسلیے اس میں قدرے اشعار آگئے ہیں۔

تینوں کی قافلہ سالاری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، منزلِ ترقی کے یہ تینوں راستے مختلف الجہات تھے، اس لیے ایسے قافلہ سالار کے لیے تصادم مصالح ناگزیر تھا۔" (شذرات معارف ج ۲ نمبر ۲)

مضمون "محبت الٰہی اور اسلام" میں لکھتے ہیں :۔

"ربانی خمخانۂ عشق کا آخری ہوشمند سرشار، ریاضِ محبت کی بہارِ جاوداں کا آخری نغمہ خوان عندلیب، نظارۂ جمالِ حقیقت کا پہلا مشتاق، مستورِ ازل کے چہرۂ زیرِ نقاب کا پہلا بند کشا زندگی کی آخری گھڑیوں میں ہے، مرض کی شدت سے بدن بخار سے جل رہا ہے، اٹھکر چل نہیں سکتا، لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضورؐ کی طرف لگی ہیں، نبوت کے آخری پیغام کے سننے کی آرزو ہے[1]۔"

سید صاحبؒ کی حسب ذیل کی کتابوں میں یہ دونوں اثر کم ہیں، اور خود ان کا نکھرا اور ستھرا اسلوب نمایاں نظر آتا ہے :

(۱) خیام (۲) خطبات مدراس (۳) سیرت عائشہؓ (۴) رحمتِ عالم (۵) نقوش سلیمانی (۶) یادِ رفتگاں (۷) عرب و ہند کے تعلقات،

ان میں سے ہر ایک شق کی کتابوں کی مدد سے ہم شبلی اور ابو الکلام کے اثر کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے، سید صاحب نے شبلی کے طرز کو سیرۃ النبیؐ کی چاروں جلدوں، نقوش سلیمانی نیز حیات شبلی میں نباہنے کی پوری کوشش کی ہے، شبلی کے ہاں بعض بعض جگہوں پر الفاظ کی تکرار ہوتی ہے جس سے عبارت میں ایک خاص قسم کی صوتی فضا قائم ہو جاتی ہے، دور دور، گھر گھر، رفتہ رفتہ، بڑے بڑے،

---

[1] خطیبانہ طرز کا یہ خاصہ ہے کہ بات تو معمولی کہنی ہے مگر اس کو پر اثر بنانے کے لیے مختلف تشبیہیں اور استعارے کام میں لائے جاتے ہیں، اس سے جملے بھی لمبے ہو جاتے ہیں، سید صاحب ایک زمانہ میں ابو الکلام کے اثر سے خطیبانہ تحریر لکھتے تھے، ان تحریروں میں یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ سید صاحب کی تحریر ہے یا ابو الکلام کی، حوالہ نمبر ۱، ۲ اردو کے اسالیب بیان مؤلفہ ڈاکٹر سید محی الدین زور سے ماخوذ ہیں، ص ۸، ۹۔

تک، ایک ایک، آہستہ آہستہ، تکرار کے علاوہ "یہ عجیب بات ہے"، "تعجب ہے" کے فقرے بھی اکثر وہ استعمال کرتے ہیں، سید صاحب سیرۃ النبیؐ کی جلد ششم کے دیباچے میں رقمطراز ہیں :۔

"یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ملی عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں۔"

اسی جلد کے خاتمے پر لکھتے ہیں :۔

"آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی آخری ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کے سامنے آ گیا[1]۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"مستدرک حاکم اس وقت نایاب تھی، اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی ہے[2]۔"

شبلی کے رنگ کی چند اور امثال ملاحظہ کیجئے :۔

"اگر افرادِ جماعت اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن و امان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے حقوق و فرائض کی تعیین کرے۔"

جہاد کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :۔

"ترقی و سعادت کا گُر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے، آپؐ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا، اسی جہاد کا جذبہ اور اسی حصولِ ثواب کی آرزو تھی، جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے

---

[1] مثلاً شبلی اس طرح لکھیں گے :۔ (۱) اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپے پر برسا (شعر العجم ج ۱، ص ۱) (۲) ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک حصہ (الغزالی ص ۲۷) [2] دیباچہ سیرۃ النبی ج ۴ ص ۹-۱۰ طبع اول۔

تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری، کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انھوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گذارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔" (سیرۃ النبی ج ۵ ص ۳۰۱ طبع اول)

سیرت کے علاوہ شبلی کے بعض رجحانات سید صاحب کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں، سید صاحب نے برامکہ کے متعلق پہلی دفعہ یہ تحقیق کی ہے کہ وہ مذہباً بدھ مت کے پیرو کار تھے، اسی تحقیق کے ضمن میں جملہ معترضہ اس طرح لکھ جاتے ہیں:-

"تعجب ہے کہ پرانے مورخوں کو چھوڑ کر یورپ کے نئے باخبر مورخوں کی بھی ادھر نظر نہ پڑی، فان کریمر نے برامکہ کو فرد کی بتایا اور پروفیسر براؤن جیسے مستشرق سے بھی یہ حقیقت چھپی رہی۔"[1]

اسی طرح خیام میں مستشرقین یورپ کی تحقیق پر جابجا طنز ہے، ایک جگہ ضمناً حاشیہ میں[2] حافظ محمود شیرانی پر بھی طنز کیا ہے، لیکن ان کے طنز میں وہ تندی اور تیزی کہاں جو شبلی کے طنز میں ہے۔

حیات شبلی کے دیباچہ کے خاتمہ کے الفاظ میں شبلی کی طرز کی پیروی ہے، شبلی کسی بات پر زور دینے کے لیے مبالغہ سے کام لیتے تھے، سید صاحب نے بھی ایسا کیا ہے، مثلاً وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سیرۃ النبی کی تالیف کے بعد لوگوں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا، اس مفہوم کو اس طرح مبالغہ کے ساتھ ادا کرتے ہیں:-

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۱۲، سید صاحب کی طنز کی بہار دیکھنی ہو تو علامہ مشرقی کے تذکرہ کے خلاف معارف کے شذرات ملاحظہ ہوں، اسی طرح ۱۹۴۰ء میں ٹنڈن جی نے جب اردو کے خلاف زہر اگلا تو اس پر بھی شذرات میں بھرپور طنز کیا ہے۔ [2] ملاحظہ ہو حاشیہ خیام ص ۲۲۲ و ۲۲۳

"صرف پچیس برس کے اندر سیرت پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں سے دفتر معمور ہو گیا ہے۔"[1]

حیات شبلی کا مقدمہ شبلی کے ذیل کے الفاظ سے شروع کیا ہے:-

"اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا جس خاک میں جس قدر قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی۔"

اسی صفحہ پر سید صاحب کی عبارت کا اسلوب یہ ہے:-

"سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پرشور کر دیا، اور غزنی سے لیکر پنجاب تک یک لخت اسلام کی حکومت قائم کر دی۔"[2]

اس میں واقعیت کے باوجود شبلی کا مبالغہ بھی ہے، اور یہ پہچاننا ذرا مشکل ہے کہ یہ دونوں جملے دو مختلف قلم کے ہیں یا ایک ہی موقلم کا کرشمہ ہیں،

مبالغہ کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:-

"اس سلسلہ میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کر کے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا۔"[3]

نقوش سلیمانی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"ہمارے دامن کا ایک ایک موتی اور ہمارے علمی خزانہ کا ایک ایک گوہر ہم سے کھو چکا ہے۔"[4]

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کے اثرات کا زور (جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے) اس زمانے میں زیادہ تھا جب سید صاحب الہلال میں کام کرتے تھے، اس زمانہ کے مقالات میں انھوں نے آزاد کے طرز تحریر کو اس حد تک اپنایا کہ ان کی بعض تحریروں کو آزاد کی تحریریں سمجھ لیا گیا، اس کی مثال "مشہد اکبر" ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، اس میں ابوالکلام کا اسلوب کس قدر غالب ہے:-

---

[1] دیباچہ ص ۵۲ [2] مقدمہ حیات شبلی ص ۱ [3] حیات شبلی ص ۵۸ [4] نقوش سلیمانی ص ۲ طبع دوم

"مقتولین کانپور! تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے، ہم گناہگار تمھاری مغفرت کی دعا کیا مانگتے؟
...... مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں، نیزوں سے تمھارے سینوں میں سوراخ کیا گیا!
تمھاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں، تمھارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا، تمھیں
یاد ہو گا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ
کا ورق الٹ گیا۔"[1] (بحوالہ حالات ابوالکلام: محمد عظمت اللہ خاں ص ۸۵)

سید صاحب بعد میں اس اثر سے بچنے کی کوشش کرتے رہے، چنانچہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:
"یہ شبہہ نہ ہو کہ "معارف" کا دامن ان داغوں سے پاک ہے یا ہم ان داغوں سے پاک ہیں یا ہم اپنے
عیبوں سے واقف نہیں۔ الہلال کا جادو جو برسوں تک رہا، اب اتر رہا ہے اور ہم خود اپنے آپ کو اور اپنے
رفیقوں کو بھی ہوشیار کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں جی چاہا کہ اپنے ہم پیشہ دوسرے ہم قلم دوستوں کو بھی
ٹوکا جائے۔" (معارف شذرات ص ۲۴۴، اکتوبر ۱۹۳۰ء)

لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ سید صاحب ابوالکلام کے اثر سے بڑی حد تک آزاد ہو گئے، مگر اس کی
پرچھائیاں باقی رہ گئیں، چنانچہ ان کی کتاب "رحمت عالم" بھی جو چھوٹے لڑکوں اور معمولی لکھے پڑھے
لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے، اور جس کی دوسری اشاعت میں زبان آسان اور ہلکی کر دی گئی ہے، اس
اثر سے خالی نہیں ہے،

"خدا کے سوا ہر باطل کا خوف، آسمان و زمین کی ہر قوت کا ڈر، ہر باطل وسوسہ کا ہراس، دیو،
بھوت پریت، چاند، سورج، ستارے، دریا، جنگل، پہاڑ غرضیکہ ہر مخلوق، ہر طاقت اور ہر مادی
اور روحانی مظہر کی خدائی ہیبت جو کمزور انسانوں پر چھائی ہوئی تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
حق کی آواز نے اس سارے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا...... اب ایک نئی قوم، نئی امت، نیا تمدن،
نیا قانون اور نئی حکومت کے پردہ میں قائم ہوئی۔" (رحمت عالم ص ۱۴۵)

آخری زمانے کی تحریروں میں بھی آزاد کا اثر کہیں کہیں نظر آتا ہے:
"پیش نظر اک ایسی ہستی کے اوراق سوانح ہیں جس نے بتیس برس (۱۸۸۲ء تا ۱۹۱۴ء) تک
ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفیوں
سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا

سالہا سال گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ است[1]

شبلی و آزاد کے ان وقتی اثرات سے قطع نظر سید صاحب کا اپنا بھی اسلوب ہے، جس میں
ان کی شخصیت پوری آب و تاب سے نمایاں ہوتی ہے، ان کے مزاج کا ٹھہراؤ، سنجیدگی اور وقار
ان کے اسلوب کا آہنگ بناتے ہیں، لیکن انھیں قاری کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنے کا ڈھنگ
بھی آتا ہے، وہ جب کوئی کتاب یا مقالہ شروع کرتے تو عموماً تمہید اس طرح اٹھاتے ہیں کہ قاری
فوراً متوجہ ہو جائے، وہ ابوالکلام کی طرح جوشیلے خطیب نہیں ہیں لیکن ایسے موقعوں پر وہ خطابت
کی ہلکی چاشنی سے عبارت کو حسین و دلکش بنا دیتے ہیں، مثلاً ارض القرآن کے جلد اول کے دیباچے کی
ابتدائی عبارت:

"آج مسلمانوں کا وطن تمام دنیا ہے، تاہم مولد اسلام، موطن رسالت، مہبط قرآن دنیا کا
ایک ہی گوشہ ہے، یعنی عرب جس کو مادی زرخیزی کی محرومی نے گو بن کھیتی کی زمین (وادی
غیر ذی زرع) کا خطاب دیا ہے، لیکن جہاں روحانی کھیتی کا کوئی سرسبز قطعہ موجود ہے، اسی
کشت زار الٰہی کے آخری کسان کی تخم ریزی و آب سیری کا نتیجہ ہے۔"

---

[1] دیباچہ حیات شبلی ص ۱، اس کے علاوہ "ارض القرآن" جلد اول میں سید صاحب کوشش کے باوجود ابوالکلام
کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکے ہیں، اس کا خود انھیں اعتراف ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی ابتدا اس طرح کی ہے:

"سیرت نبوی کا یہ حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے جن کا تعلق ماورائے عالم مادی و قوانین مادی سے ہے، جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام پر چل رہی ہے، شگوفے کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات میں ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا خاص نظام رکھتا ہے اور اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے خزاں اور بہار ہے فصل و موسم ہے۔"

سیرۃ النبیؐ جلد ششم کی تمہید یہ ہے:-

"عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبویؐ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے......... دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و امان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت و قوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔"

گو ان تحریروں میں شبلی کے قلم کی شوخی اور ابوالکلام کا جوش و خروش نہیں ہے لیکن وہ ایک زاہد خشک کی روکھی پھیکی عبارت بھی نہیں، اور اس میں ایک منجھے ہوئے صاحبِ فن کی صناعی نظر آتی ہے، سید صاحب کا پُر وقار اور متین لب و لہجہ اس عبارت کی جان ہے جس سے پڑھنے والا مصنف کے وقار سے متاثر ہو کر اسکے عالمانہ مطالب کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

سید صاحب جس طرح اپنی تصنیف کا آغاز محنت اور سلیقے سے کرتے ہیں، اسی طرح اس کے انجام کو بھی پوری طرح سنوارتے اور بناتے ہیں جس سے قاری ایک خاص قسم کا لطف اور چاشنی محسوس کرتا ہے،

ایسے موقعوں پر سید صاحب کے قلم میں عجیب طرح کا جوش اور لطف زبان پایا جاتا ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا ہے:-

"کاغذ کے سات سَو صفحات سیاہ ہو چکے، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہرو قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقا بھی کچھ دیر آرام کریں، ہر چند کہ

رہروان را خستگیِ راہ نیست

عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است[1]

عرب و ہند کے تعلقات کے خاتمہ کی عبارت یہ ہے:-

"ان گذشتہ اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ ہم اپنے ہم سفروں کو عرب و ہند اور اسلام و ہندوستان کے باہمی تعلقات کے وہ مناظر دکھائیں جو خیبر سے آنے والے مسلمان فاتحین سے پہلے بھی وہاں جلوہ گر تھے، ان سے اندازہ ہوگا کہ فتوحات سے پہلے بھی اس ملک میں کہاں کہاں مسلمان آباد تھے، اور ان کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ کیسے چند در چند اور گہرے تھے اور اسلام کا تعلق ہندوستان سے کتنا پرانا اور قدیم ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس[1]

حیات شبلی کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے:-

"ناظرین! آپ نے نو سَو صفحوں تک میری رفاقت کی، اس اثنا میں آپکے رفیق سفر اور رفیق نظر نے ایک مجسمۂ علم و فن اور پیکر خدمت دین و ملت کی زندگی کا مرقع جیسا کہ اس نے دیکھا یا دیکھنے والوں نے بتایا

[1] شبلی کی بہت سی کتابیں اشعار سے شروع ہوئی ہیں اور بعض اوقات اشعار ہی پر ختم ہوئی ہیں، مثلاً الغزالی، علم الکلام، شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر کا آغاز اشعار ہی سے ہوا ہے، شعر العجم جلد چہارم کا آغاز و انجام اشعار سے ہوا ہے، سید صاحب کی یہ پہلی کتاب ہے جس کا آغاز اور انجام اشعار سے ہوا ہے۔ ص ۳۰۲

کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا، اس مرقع میں کہیں کہیں بشری کمزوریوں کی جھائیاں بھی ہونگی لیکن مجموعی طور سے حسن وجمال کا ایک غیر معمولی منظر بھی تصور کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، آیئے ہم اور آپ اس کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائیں اور زبان سے کہیں اللھم اغفر لہ وارحمہ

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

سید صاحب مزاج انسانی کے بھی بڑے واقف کار ہیں، اس لیے جس طبقہ کو مخاطب بنانا ہوتا ہے، اس کے ذوق کے مطابق زبان و بیان اختیار کرتے ہیں، چنانچہ جب اردو (سید صاحب کی اصطلاح میں ہندوستانی) زبان کے متعلق کچھ کہنا ہوتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان کی بات زیادہ عام فہم اور موثر ہو تو عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں اور ان کا اسلوب عربی و فارسی کے مشکل اور عالمانہ الفاظ و تراکیب سے خالی اور ہندی اور بھاشا کے نامانوس اور ثقیل الفاظ سے پاک ہوتا ہے، ہندی اور ہندوستانی کے سلسلے میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:-

"ہندو یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر اپنے مضمون کی ضرورت سے میرے پاس اکثر آتے رہے، لیکن اگر انگریزی کا سہارا نہ ہوتا تو نہ میں ان کی سمجھ سکتا تھا اور نہ وہ میری، کیا مجھکو اور ان کو کوئی ایک دیس کا رہنے والا سمجھ سکتا ہے؟ ہندی جس طرح سنسکرت سے کٹ چھنٹ کر بنی ہے، اسی طرح ہندی سے کٹ چھنٹ کر ہندوستانی بنی ہے، اب ہمارے ہندو دوستوں کی یہ کوشش کہ پھر ہندی لفظ کو اسی روپ میں بولیں، جس میں وہ ٹھیٹ ہندی میں بولا گیا ہے، ایک طرح کا بڑا ظلم ہے۔" (نقوش سلیمانی ص ۹۴ طبع دوم)

فصاحت کا یہ وصف سید صاحب کی تحریر کا خاصہ ہے، وہ قاری کی ذہنی سطح کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے، عالمانہ مباحث میں ان کے مخاطب اہل علم ہوتے ہیں، اس لیے ان میں ان کا لب ولہجہ بھی بدجاتا ہے تحقیقی اور علمی مباحث میں شبلی کا تخیل بلند پرواز ہو جاتا ہے، ابوالکلام آزاد خطابت کا سہارا لیتے ہیں، محمد حسین آزاد "لفظوں کے طوطے مینا" اڑانے لگتے ہیں، لیکن سید صاحب ایسے موقع پر بھی سنجیدگی اور توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اس لیے ان کا اسلوب تحقیقی اور علمی مباحث کے لیے دوسرے

صاحب طرز ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہے،

ان کی تین کتابیں خیام، عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی اس کی شاہد ہیں، خصوصاً خیام جو انکی تحقیقی کتابوں میں سب سے اہم درجہ رکھتی ہے، اس خوبی میں سب سے بڑھ گئی ہے، مثلاً:-

"خیام کچھ بھی تھا اور کچھ بھی ہو، مگر آج اس کی شہرت صرف اس کی فارسی رباعیات کی بدولت قائم ہے، خصوصاً آج لوگوں کو جو اس سے دلچسپی ہے، وہ صرف اس لیے ہے کہ یورپ فٹز جیرلڈ کے انگریزی ترجمہ کے بدولت اس سے دلچسپی لے رہا ہے، ورنہ تنہا ایک رباعی گو شاعر کی حیثیت سے مشرق میں اس نے کوئی بڑا درجہ نہیں پایا ہے۔" (خیام ص ۲۱۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"۴۲۹ھ میں نیشاپور کے مطلع سے سلجوقی دور کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، سلجوقیوں کا زمانہ اس صنف سخن کے اوج شباب کا زمانہ ہے، اس عہد میں رباعی گوئی سلاطین، وزراء، امراء، علماء، حکماء اور عام شعراء کا دلچسپ مشغلہ ہو جاتا ہے، اسی میں سوال وجواب ہوتے ہیں، حسن وعشق کی روداد بیان کیجاتی ہے، مناظر قدرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں، اور بادۂ وساغر کی نئی نئی تشبیہوں کے مرقعے تیار کیے جاتے ہیں، اس عہد میں ہر قسم کی عشقیہ، خمریہ، حکیمانہ اور صوفیانہ رباعیات کے دفتر ملتے ہیں، یہی زمانہ خیام کی رباعیوں کا ہے۔" (خیام ص ۲۴۳)

لکھنؤ کے پرانے ادبی ماحول یعنی رعایت لفظی کا اثر بھی کہیں کہیں سید صاحب کی تحریروں میں نظر آتا ہے، لیکن اس میں اعتدال کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، اسکی مثال ملاحظہ ہو:

"اگلے زمانے میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیے تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ملتے جلتے پرندے کی نسبت سن لیجئے۔" (نقوش سلیمانی ص ۳۰۴ طبع دوم)

ایک جگہ سلسلۂ کلام میں اصغر گونڈوی کا ذکر آجاتا ہے تو لکھتے ہیں:-

"اور وہیں سے اٹھا نشاط روح مطبوع ہو کر نشاطِ دو عالم کا باعث ہوا۔" (نقوش سلیمانی ص ۷، طبع دوم)

لفظ نستعلیق کے سلسلے میں تحقیق کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"اسی سے ہماری زبان میں یہ وسعت پیدا ہوئی کہ نستعلیق لباس، نستعلیق چال اور نستعلیق بول چال کہنے لگے۔" (ایضاً ص ۹۴)

پانی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"پانی ہندی لفظ ہے ۔۔ اب لفظی چھوت کے ڈر سے آپ پانی چھوڑ کر "جل" پینے لگیں تو کتنی بری لگی ہے۔" (ایضاً)

سید صاحب خطابت کا بے موقع استعمال نہیں کرتے، اس میں بھی وہ افراط و تفریط سے بچتے ہیں، اعتدال ان کے مزاج کا بنیادی وصف ہے، جسے وہ کسی قیمت پر بھی قربان نہیں کرتے، مجالس کی صدارت بھی انھیں کرنا پڑی، ان میں خطبے بھی پڑھے لیکن کہیں ان کا قدم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹا، یہ خطبات نقوش سلیمانی میں شامل ہیں، ان کی زبان مقدمات و مقالات سے قدرے مختلف ہے، یہی حال خطباتِ مدراس کا بھی ہے، یہ خطبات مقالے کے طور پر پڑھنے کے لیے لکھے گئے تھے، اس لیے ان میں عبارت آرائی کا تھوڑا سا لحاظ ہے اور اس میں الفاظ کی شوکت، فقروں کی برجستگی، ترکیبوں کی چستی اور بیان کی دلکشی کا اہتمام نظر آتا ہے، مثلاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا ۱۹۱۵ء کے شعبہ ترقی اردو کے خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں :۔

"حضرات! آج مجھے ہندوستان کی ایک عظیم الشان تعلیمی مجلس کے، ایک علمی شعبہ کی صدارت کی عزت ملی ہے، یہ بظاہر میرے لیے مسرت کا دیباچہ تھا، لیکن آہ! اس دیباچہ میں بدبختی اور شومیٔ نصیب کے کتنے ابواب اور فصول ہیں، اب سے صرف ڈیڑھ سال پہلے اس اعزاز کے لیے اکابر کے نام پیش کیے جا سکتے تھے، حضرت الاستاذ علامہ شبلی، شمس العلما، مولانا حالی، خواجہ غلام الثقلین، ہماری زبان کے وہ ارباب قلم اور ہندوستان کے وہ سحر نگار ادیب تھے، جن کا وجود ہمیشہ قوموں اور ملکوں کی عزت کا تاج ہوتا ہے، لیکن بدنصیبی کی انتہا ہے کہ ہمارے دامن کا ایک ایک موتی اور ہمارے علمی خزانہ کا ایک ایک گوہر ہم سے کھو چکا ہے، اور اسلامی ہند کے خلوت کدہ میں فضل و کمال کا کوئی چراغ نظر نہیں آتا ع

افسوس کہ قبیلۂ مجنوں کسے نماند۔" (نقوش سلیمانی حصہ دوم ص ۱۵)

اسی طرح "ہندوستان میں ہندوستانی"، "ہندوستانی اکاڈمی" اور مسلم یونیورسٹی کے بعض صدارتی خطبات کا آغاز و خاتمہ بھی بڑا موثر ہے :۔

خطباتِ مدراس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"واقعات کی انتہا نہیں ہے، مثالوں کی کمی نہیں ہے، مگر وقت محدود ہے، اور آج شاید میں نے سب سے زیادہ آپ کا وقت لیا ہے، میرے دوستو! میرے معروضات کی روشنی میں آدمؑ سے لیکر عیسیٰؑ تک اور شام سے لیکر ہندوستان تک، ہر ایک تاریخی انسان کی مصلحانہ زندگی پر نظر ڈالو، کیا ایسی عملی ہدایتوں اور کامل مثالوں کا کوئی نمونہ کہیں نظر آتا ہے؟"

حاضرین! چند لفظ اور!

بعض شیریں بیان واعظ شاعرانہ پیرایہ میں اپنے "خداوند" کی ربانی محبت اور الٰہی عشق کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر انھیں کے مقولہ کے مطابق کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔" اس پاک عشق و محبت کا کیا اثر ان کی زندگی میں نمایاں تھا؟" (خطبات مدراس ص ۱۴۹)

کراچی کے خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں :۔

"ہم صفیرو! آپ کی زندگی کے ایک نئے موڑ اور سفر کے ایک نئے راستے کے لیے تیاری کر رہے ہیں، اس لیے ہمارا دامن ان داغوں سے پاک ہو جن سے گذشتہ مورخوں کے دامن داغدار ہیں، حرص و طمع کی ناجائز امید اور ڈر اور خوف کے ناجائز دباؤ سے بے پرواہ ہو کر دنیا کے واقعات کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دینا چاہیے جس کے لیے مورخ پیدا کیا جاتا ہے، اب نہ اکبر اور شاہجہاں کے زر و سیم کی امید ہے اور نہ محمد تغلق اور اورنگ زیب کی تلوار کا خوف ہے، اب تو جو کچھ ہے وہ ملت کی خاطر اس استبداد کی تحریر و تدوین ہے۔" (The Proceedings of This Tory conference, held at Karachi. P35)

لیکن یہ خطابت ہلکے رنگ اور نرم لب و لہجہ کی خطابت ہے، اس میں وہ کڑک اور گرج نہیں ہے جو

عام طور سے عام خطابت کا جزو سمجھی جاتی ہے، اس میں تخیل کی بے راہ روی بھی نہیں ہے جس کے لیے خطیب بدنام ہوتے ہیں، سید صاحب نے خطابت کو ایک شائستہ اور خوشگوار لب و لہجہ عطا کیا، اس میں پُرشور سیلاب کی جگہ ایک سبک رفتار ندی کی کیفیت ہے جس کا رشتہ ان کی دوسری کتابوں اور تحریروں سے ملا ہوا ہے، اگر کلمات خطاب کو حذف کر دیا جائے تو ان تقریروں اور سید صاحب کی دوسری تحریروں میں کوئی نمایاں فرق باقی نہیں رہتا۔

خطیبانہ لب و لہجہ سے سید صاحب نے ایک اور جگہ بھی کام لیا ہے، شعراء اور ادباء کے کارناموں کے جائزے میں یہی خطابت، انشا پردازی کے روپ میں نظر آتی ہے، ان دونوں میں ایک مماثلت ہے، خطیب زبان کی مدد سے سامعین کے دلوں کو متاثر کرتا ہے، انشا پرداز یہ کام تحریر سے لیتا ہے۔

سید صاحب شعراء اور نثر نگاروں کا جائزہ لیتے وقت، انشا پردازی سے کام لیتے ہیں، اس وقت ان کی تحریر علمی مقالہ نہیں رہتی، ایک ادب پارہ بنجاتی ہے،

جگر کے متعلق لکھتے ہیں :-

"جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے، نہ سرمۂ و آئینہ، نہ ہوس بالائے بام، نہ شکایت منظر عام، نہ اس کے کاشانۂ خیال میں چشم ہائے بسمل کی آئینہ بندی، نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچہ میں شہدا کے دل و جگر کی گلکاری ہے، وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر۔" (نقوش سلیمانی ص ۴۳۱)

مہدی افادی کے مکاتیب کی خصوصیات بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں،

"مہدی افادی مرحوم کے خطوں کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان میں مصوری کا کمال نہیں، تصویر فطرت کا جمال ہے، ان کا حسین خیال اپنے پیکر ظہور کے لیے اپنی پسند کا لباس پہنکر جلوہ افروز ہے، وہ آسمان تشبیح کے ستاروں کی طرح دوسروں کی پسند کا لباس پہنکر جلوہ فروش نہیں۔" (نقوش سلیمانی ص ۳۸۹)

اکبر کا ظریفانہ کلام، گلستان امجد، مقدمہ مکاتیب شبلی وغیرہ تنقیدی مقالات اس خصوصیت کے حامل ہیں۔

سید صاحب کی پرتاثیر انشا اور کمال تحریر کا نمونہ انکی وہ تحریریں بھی ہیں جو انھوں نے اعزہ، احباب اور علماء و اصحاب کمال کی وفات پر لکھی ہیں، وہ جب کسی رفیق کا نوحہ لکھتے ہیں تو اس میں اپنے دلی جذبات کو اس طرح سمو دیتے ہیں کہ دل کا ایک ایک تار اس کے ساتھ بندھ جاتا ہے، ان تحریروں کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

"اسلامی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں، لاکھوں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئی ہیں، کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بنجائیں۔" (یادرفتگاں ص)

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کو ان کی ایسی تحریروں کی تاثر آفرینی، ادبیت اور اہمیت کا بڑا احساس ہے، چنانچہ انھوں نے ایک موقع پر تحریر فرمایا تھا کہ

"سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے جو ان کے سامنے وفات پائے اور اس کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصہ میں آئے۔" (معارف سلیمان نمبر ص ۳۹)

یہ نقوش غم[1] ادب و انشاء کا بہترین نمونہ ہیں، ان کے قلم نے علامہ شبلی نعمانی، اپنی رفیقۂ زندگی، اکبر الہ آبادی، مولانا عبد الرحمن نگرامی ندوی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حبیب الرحمن شروانی، اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ بہت سے اعزہ و اکابر کی یاد میں آنسو بہائے ہیں، اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

مولانا محمد علی کی وفات پر لکھتے ہیں :-

"تو ملت کا عزادار تھا، حق یہ ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو، تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم کناں، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے غمزدہ، بلقان کے لیے اشکبار، شام پر

[1] ان نقوش غم میں ۱۳۵ شخصیتوں کی وفات پر تاثرات ہیں جو یادرفتگاں کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں۔

گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لیے وقف الم۔ اے ہند کے آوارہ گرد مسافر!
تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے
اور تو اس میں سما جائے۔" (یاد رفتگاں ص ۱۵۵)

اپنے مرشد مولانا اشرف علی تھانوی کی وفات پر ان الفاظ میں ماتم کرتے ہیں:۔

"جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں
یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق و عشق، مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت
و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم
ہم آغوش کیا تھا، اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و
تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا، اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی
دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا، اور اسی لیے دنیا نے اس کو
حکیم الامت کہہ کر پکارا........" (یاد رفتگاں ص ۲۸۴)

ان تحریروں میں خاص بات یہ ہے کہ سید صاحب عام روش کے مطابق آخر میں محض دعائیہ
کلمات پر اپنے تاثرات کو ختم نہیں کرتے بلکہ اکثر ایسے فقرے لکھ جاتے ہیں جن سے حزن و یاس کا ایک گہرا
تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر طاری ہو جاتا ہے، اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

اکبر الہ آبادی کا ماتم ان الفاظ پر ختم کیا ہے:۔

"بوڑھے اکبر! مبارک ہو کہ تیرے دل کی مراد پوری ہوئی اور تجھے مسرت جاوید نصیب ہوئی۔" (یاد رفتگاں ص ۴۲)

علامہ اقبال کا ماتم ان فقروں پر ختم ہوتا ہے:۔

"اقبال، ہندستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا
دانا اقبال، کاروان ملت کا رہنما اقبال! رخصت، رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک و رحمۃ اللہ الی یوم التلاق"
(یاد رفتگاں ص ۲۱۱)

علامہ شبلی نعمانی کے دفن ہونے کے بعد کا یہ جملہ کس قدر موثر ہے:۔

"استاد بزرگوار! جا جا! اور سایۂ رحمت میں آرام کر، دنیا تجھکو بہت ڈھونڈھے گی لیکن
نہ پائے گی۔" (حیات شبلی ص ۷۹۰)

حسرت موہانی کے غم فرقت کا افسانہ ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:۔

"حسرت رخصت! تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا، البتہ تیری نیکی، شرافت، تیرا اخلاص، اور
تیرے حسن عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں اور وہی تیرے رفیق آخرت بھی، بار الٰہا! اس کی حق گوئی
کی بےکسی کی شرم رکھ لیجیے اور اس کو اپنی رفاقت سے نوازیے، وانت الرفیق الاعلیٰ۔" (یاد رفتگاں ص ۴۵۶)

یہ نثر پارے نثر کے بجائے شعر منثور کہلانے کے مستحق ہیں، سید صاحب کی نثر نگاری اس میں اپنے انتہائی
کمال کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔

ان کے اسلوب کے عام خط و خال یہی ہیں، یہ اوصاف تقلید سے نہیں خون جگر سے حاصل ہوتے
ہیں، انھوں نے اپنی تحریر پر بڑی محنت کی اور اسے اپنی شخصیت کا آئینہ بنانے میں پورے انہماک سے
کام لیا، اس لیے جو شخص اس طرز کو اپنانے کی کوشش کرے گا وہ محض خارجی اوصاف ہی کی تقلید کر سکتا
ہے، ان کے مزاج کی ہمواری، نرمی اور اعتدال اس کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔

سید صاحب کے تلامذہ اور ارادت مندوں نے ان کی طرز تحریر کو اپنایا ہے، چنانچہ مولانا شاہ
معین الدین ندوی مدیر معارف کے شذرات اور سید صاحب کے شذرات میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے[1]،
اسی طرح سید نجیب اشرف ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن وغیرہم نے سید صاحب کے اسلوب کی
تقلید کی ہے مگر یہ اثر محض اسلوب کی خارجی وضع تک ہے، اصل روح تو گرفت میں آنے والی چیز نہیں۔

[1] سید صاحب نے خود محسوس کر لیا تھا کہ شاہ معین الدین ندوی ان کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش میں کامیاب ہو رہے ہیں، چنانچہ
ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں: "معارف میں آپ کے شذرات پڑھے، بحمد اللہ آپ نے شذرات کے معیار کو قائم رکھا، "س" اور "م"
میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہو۔" (معارف فروری ۱۹۵۷ء، مکتوب نمبر ۵)

دوسرے ادبا نے بھی سید صاحب کے اسلوب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

آل احمد سرور صاحب نے حیات شبلی کے دیباچے کی تعریف کے بعد لکھا ہے:-

"حیات شبلی کا یہ حصہ بہت اہم ہے اور لکھنے والے کی عقیدت کے علاوہ اسکے اپنے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔"[1]

مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی تحریر فرماتے ہیں،

"سیرۃ النبی میں معجزات کی بحث پڑھیے یا "ارض القرآن" میں جغرافیائی و تاریخی تحقیقات ہر جگہ آپکا ادبی حاسہ اپنی غذا پائے گا اور آپسے پڑھنے کی سفارش کرے گا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کی تحریر میں مولانا شبلی کی برجستگی و بے ساختگی اور فارسی ترکیب کی چستی نہیں مگر شیرینی و سلاست اور ادبی محاسن پورے پورے موجود ہیں اور انکی علمی تصانیف تک کے بعض ٹکڑے شہ پارے معلوم ہوتے ہیں، خطبات مدراس کے بعض پیراگراف، سیرۃ النبی کے بعض صفحات اور معارف کے بہت سے شذرات و تحریریں ہیں جن پر سہارے ادب عالی کو ملکیت کا دعویٰ ہے، نقوش سلیمانی کے بعض نقش ادبی حیثیت سے تعویذ بنا کر رکھے جانے کے قابل ہیں۔"[2]

مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی سید صاحب کی نثر نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں:-

"سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اٹھائیے تو دیدہ و دل حیران کہ شروع کہاں سے کیجئے اور خط تمت کہاں پہنچکر کھینچئے، سیرۃ النبی کی ضخیم مجلدات سے لیکر خیام، خطبات مدراس اور رحمت عالم تک بڑی اور چھوٹی کتابوں تک کونسی ایسی ہے، جہاں سلیمان ایک خشک ملانے معلوم ہوتے ہیں، اور صحت زبان و سلاست بیان نمایاں نہ ہو؟ شستگی، متانت، شرافت، یہ تو ان کے اسلوب کے جوہر اصلی ہیں، اور اس پر شوخی و ظرافت کی گلکاریاں اور حسن صناعت کی سحر طرازیاں، جیسے خاتم سلیمانی میں نگیں۔"[3]

ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب لکھتے ہیں:-

"آپ نثر لکھنے میں ایک خاص طرز کے مالک ہیں، ان کی عبارت میں ادبیت و پختگی کے علاوہ علمیت

۱؎ تنقیدی اشارے" ص ۲۱۲ ۲؎ روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ ۳؎ معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۲

کا بھی ذخیرہ رہتا ہے، لیکن علمیت ایسی نہیں جو کانوں کو گراں محسوس ہو، بلکہ عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کا استعمال کرنا اب ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا جن کے بارے میں ہم اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں کر سکتے، سید سلیمان ندوی لفظوں کی رنگینی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ نہیں بناتے، ان کے نزدیک رنگینی کا نام ادبیت نہیں بلکہ اپنے خیالات اور الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان عالمانہ حقیقتوں میں ادبیت کے مزے لیتا ہے۔"[1]

نسیم قریشی صاحب رقمطراز ہیں:-

"سید سلیمان کی انشا میں ایک بیدار فکر، محتاط عالمانہ ذہن اور نہایت ستھری اور لطیف طبیعت کا جوہر بکھرا ہوا ملتا ہے، وہ بہت متانت اور سنجیدگی سے قلم اٹھاتے ہیں، اور از اول تا آخر ادبی بلاغت کا معیار قائم رکھتے ہیں۔"[2]

سید ابو الخیر کشفی اور ظہیر الدین احمد صاحبان تحریر فرماتے ہیں:-

"سید سلیمان ندوی کا انداز تحریر صاف اور سلیس ہے یہ سادگی بے رنگ نہیں بلکہ اس میں رعنائی اور لطافت بھی ہے، مگر اس قدر جو مذہبیات اور تاریخ کے موضوعات کے مطابق ہے، ان کا خلوص الفاظ میں کیمیاوی تغیرات پیدا کر دیتا ہے، اور اسی لیے ان کے یہاں بے حد تاثر ہے۔"[3]

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے خطبات مدراس[4] پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحب کے اسلوب کو اس طرح سراہا ہے:-

"ان اٹھائیس برسوں میں وقت کے تقاضے کہیں سے کہیں پہنچ گئے، زمانے کی گردش کا رنگ کچھ اور ہی ہو گیا۔"[5]

۱؎ مختصر تاریخ ادب اردو ص ۴۲۲ و ۴۲۳ ۲؎ اردو ادب کی تاریخ ص ۲۲۱ ۳؎ اردو نثری ادب ص ۱۵۰، ۴؎ مہدی افادی نے ارض القرآن کے متعلق جو تاثر دیا، اس میں یہ بھی لکھا "سو بیت سے زیادہ آپ کی ادبیت سے مرعوب ہو رہا ہوں زبان نفس موضوع کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں۔" پورا اقتباس پہلے نقل کیا جا چکا ہے (شخصیات نمبر جلد اول ص ۱۶۲)

طریق فکر اور اسلوب زبان کے سانچے یکسر بدل چکے ہیں، یہانتک کہ دلائل و براہین کا جو قالب اب سے تیس چالیس سال پہلے دلپذیر اور موثر سمجھا جاتا تھا، آج بے جان اور افسردہ ہو کر رہ گیا ہے اور دنیا اب وحی و نبوت اور الٰہیات کے مسائل کو ایک دوسرے ہی ڈھنگ پر سوچنے کی عادی ہو گئی ہے، لیکن تیس سال پہلے کے لکھے ہوئے ان مقالوں کے اسلوب اور طرز استدلال پر گہری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی دل نشینی و دلپذیری اور شادابی و شگفتگی آج بھی اسی طرح باقی ہے، اور جہانتک سیرت نبوی کی خصوصیات اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کو یورپ کے ذہن و دماغ سے قریب کرنے اور اسی لب و لہجہ میں سمجھانے کا تعلق ہے لاریب کوئی دوسرا انداز بیان اس سے زیادہ اثر انگیز نہیں ہو سکتا۔"[1]

پروفیسر ادیب نے "نقوش سلیمانی" کی روشنی میں سید صاحب کے اسلوب بیان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، آخر میں لکھتے ہیں :-

"علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کی زبان اور اسلوب بیان میں بحیثیت مجموعی ان کے استاد مولانا شبلی مرحوم کی سلاست و روانی اور تلاش و تجسس، وسعت فکر و نظر اور استقصاء، مولوی محمد حسین آزاد کی شوخی و زندہ دلی اور وحید الدین سلیم کی متانت، سادگی اور ادبی کاوش جلوہ گر ہے۔"[2]

غرض سید صاحب اردو کے ایک صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز ہیں، ان کی علمی حیثیتوں کو اگر وقتی طور پر فراموش بھی کر دیا جائے جب بھی ان کا نام اپنی "دلکش اور معتدل" نثر کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

---

[1] برہان مارچ ۱۹۵۴ء ص ۱۸۰ [2] "علامہ سید سلیمان ندوی کے اسلوب بیان پر ایک نظر" معارف اپریل ۱۹۵۶ء ص ۲۴۹

یورپ میں اسلام کی اشاعت

مترجمہ جناب مولوی ابوالبقا صاحب ندوی

مسلمانوں نے یورپ کے دو خطوں پر حکومت کی اور اسلامی تمدن ابتداءً انہی دونوں راستوں سے یورپ میں داخل ہوا، یہ دونوں ملک اسپین (اندلس) اور سسلی (صقلیہ) ہیں، اندلس کے راستے سے عرب فرانس کے جنوب تک پہنچ گئے تھے۔ اور اگر ۷۳۲ء مطابق ۱۱۴ھ میں چارلس مارٹل نے مسلمانوں کو روکا نہ ہوتا تو عرب فرانس کے قلب میں پہنچ گئے ہوتے صقلیہ کے راستے سے مسلمانوں نے اٹلی کے جنوبی حصوں تک اپنی حکومت قائم کی، اور اگر مجاہدین اسلام ملکی انتظامات میں مشغول نہ ہو گئے ہوتے تو اٹلی کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے روم کے پایۂ تخت تک قبضہ کر چکے ہوتے،

پندرہویں صدی عیسوی میں ترک بھی یورپ میں داخل ہوئے لیکن وہ جلد ہی اپنے ملک واپس ہو گئے، یہ حقیقت ہے کہ مسلمان یورپ میں جہاں کہیں بھی گئے اس خطہ کو اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پرشور رکھا، اور اپنے علوم و فنون اور اپنی تہذیب و ثقافت کے ایسے نقش چھوڑے جس سے متاثر ہو کر یورپ کی قومیں اسلام کی حلقہ بگوش ہو گئیں، انھوں نے اسلامی علوم و فنون اور اسلامی صنعت و حرفت کے حصول میں خاص توجہ صرف کی اور اس کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں ایسے شعبے قائم کیے گئے جن میں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و تمدن کا خاص طور پر درس دیا جاتا تھا، اور کثرت سے اسلامی علوم و فنون کی کتابیں

یورپ کی زبانوں میں منتقل ہوئیں،

یورپ کے تمام جزیروں میں جزیرۂ صقلیہ عرب سے قریب تر تھا، صقلیہ فنیقی، قرطاجنہ اور رومی تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہونے کی بنا پر زیادہ مشہور تھا، اس کی ترقی کا سبب یہ بھی تھا کہ بحر روم زمانۂ قدیم سے یورپ، ایشیا اور افریقہ کی مختلف قوموں کا رابطۂ اتصال رہا ہے، اس لیے بحر ابیض اور بحر روم کے ذریعہ قرطاجنہ اور شمالی افریقہ کے باشندے آکر صقلیہ میں آباد ہوگئے، جس سے وہ مشرقی، یونانی، فنیقی اور رومی تہذیبوں کا گہوارہ بن گیا،

صقلیہ چونکہ افریقہ کی شمالی سرحد سے متصل تھا اس لیے افریقہ کی فتح کے بعد ضروری تھا کہ اسلامی مقبوضات اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے صقلیہ کو اسلامی مقبوضات میں شامل کیا جائے، اس لیے قدرۃً مسلمانوں کو اس کے فتح کرنے کی فکر ہوئی، سب سے پہلے امیر معاویہؓ والی شام نے سرقوسہ پر حملہ کے لیے ایک فوج روانہ کی، جو کچھ علاقوں کو فتح کرنے کے بعد شام واپس آگئی، پہلی صدی ہجری کے آخر میں موسیٰ بن نصیر نے ایک اسلامی بیڑا اپنے لڑکے عبد اللہ کی سرکردگی میں صقلیہ کی سمت روانہ کیا، جو برقہ، مرقہ، سردانیہ اور صقلیہ کے ساحلی علاقوں کو زیرنگیں کرکے اور مال غنیمت حاصل کرکے لوٹ آیا، اس کے بعد بھی صقلیہ پر کئی بار فوجکشی ہوئی، لیکن عرصہ تک یہ مہم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی، لیکن ان حملوں سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ رومی اور افریقہ کے حاکم مسلمانوں سے ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم ہوگئے،

۸۲۷ء میں بزنطی حاکم کے خلاف سرقوسہ کے عوام نے بغاوت کردی اور افریقہ کے حاکم سے مدد چاہی، اس وقت اغلبی خاندان کا فرمانروا زیادۃ اللہ اول (۸۱۷ء۔ ۸۳۸ء) افریقہ پر حکمرانی کررہا تھا، اس نے سرقوسہ کے باغیوں کی مدد کے لیے ایک لشکر جرار اسد بن فرات کی سرکردگی میں جزیرہ کو روانہ کیا، پورا لشکر ستر جنگی جہازوں پر مشتمل تھا جن میں سات سو سوار

اور دس ہزار پیادہ فوج تھی، سب سے پہلے یہ بیڑا مازر میں لنگرانداز ہوا، مازر کو فتح کرنے کے بعد اسلامی لشکر نے سرقوسہ کا قصد کیا، اور اس کا محاصرہ کرلیا، ابھی محاصرہ جاری تھا کہ اسلامی لشکر میں وبا پھیل گئی، اور امیر لشکر اسد بن فرات انتقال کرگئے، اس وبا میں اور بہت سے آزمودہ کار افسروں اور مجاہدین کی جانیں تلف ہوگئیں، اس لیے سرقوسہ کا محاصرہ اٹھا لیا گیا، جب فوج میں سکون ہوا تو مجاہدین نے پھر پیش قدمی شروع کردی اور ۸۳۱ء میں بلرم جو فنیقی دور کا آباد اور مضبوط شہر تھا فتح کرلیا، اس کے بعد مسلمانوں نے سرقوسہ کے گرد و نواح میں چھوٹی چھوٹی فتوحات حاصل کیں، اور نو مہینے کی مسلسل چھوٹی بڑی جنگوں کے بعد صقلیہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہوگیا، اس کوشش میں تقریباً ۸۰ سال صرف ہوئے تھے۔

اس کے بعد ۸۳۷ء میں نابولیوں کی خواہش پر عربوں نے اٹلی کا رخ کیا، اور بڑھتے ہوئے اٹلی کے جنوبی حصہ قلوریہ تک پہنچ گئے، اس طرح ان عرب مجاہدین کے ذریعہ جنوبی اٹلی تک اسلامی تہذیب و تمدن پہنچ گیا، ساتویں صدی کے نصف آخر میں اٹلی اور عربوں میں ایک خونریز جنگ ہوئی جس سے عربوں کی پیشقدمی رک گئی، اس کے باوجود عربوں نے اٹلی کے آٹھویں حکمران پوپ یوحنا (۸۷۲ء۔ ۸۸۲ء) سے برابر دو سال تک جزیہ وصول کیا،

دسویں صدی کے آخر تک مسلمانوں نے صقلیہ پر حکومت کی، لیکن پھر ان کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھاکر ۱۰۹۱ء میں نارمنوں نے چالیس سال کی مدت میں پورے صقلیہ پر قبضہ کرلیا، ابتدائی دور کے نارمن فرمانرواؤں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے مٹانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیکن بعض فرمانرواؤں کے دور میں صقلیہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو ترقی کرنے کا موقع بھی ملا، مثلاً راجر اول المتوفی ۱۱۰۱ء کو اسلامی تہذیب و ثقافت سے شدید شغف تھا، اس نے حکومت کے اکثر شعبوں میں مسلمانوں کو رکھا، بلرم (پلرم) نے اتنی ترقی کی کہ وہ مشرق کا ایک خطہ بن گیا تھا،

عربوں نے صقلیہ میں ایک نئی تہذیب کو جنم دیا، جو "دور جدید" کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اس میں کثرت سے مسجدیں تعمیر اور ہر طرح کی ملکی و معاشرتی ترقیاں ہوئیں، ابن حوقل اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے، کہ اس نے بلرم میں صرف گوشت کی ایک سو پچاس دکانیں اور تقریباً تین سو مسجدیں دیکھی تھیں، جن میں ہر مسجد اتنی بڑی تھی کہ اس میں ۳۶ صفیں ہوتی تھیں، اور ہر صف میں تقریباً دو سو (۲۰۰) آدمی نماز پڑھتے تھے، اس طرح تمام مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کی تعداد سات ہزار تھی،

راجر اول کے بعد راجر ثانی صقلیہ کا فرمانروا ہوا، یہ اسلامی تہذیب و ثقافت میں انگریزوں سے بڑھا ہوا تھا، حتیٰ کہ اس کے جبہ پر عربی الفاظ کڑھے رہتے تھے، اس کے پوتے ولیم دوم ۱۱۶۶ء – ۱۱۸۹ء کی پرورش و پرداخت چونکہ اسلامی طرز پر ہوئی تھی، اس لیے اس کے دور حکومت میں اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات کا رنگ وہاں کی معاشرت پر غالب رہا، ابن جبیر اندلسی اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ بلرم کی عیسائی عورتوں نے بھی اسلامی معاشرت قبول کر لی تھی، یہاں تک کہ بغیر حجاب و نقاب کے باہر نہیں نکلتی تھیں، راجر ثانی نے ادریسی کو صقلیہ مدعو کیا اور جب وہ اس کے دربار میں پہنچا تو اس نے اسکی نہایت عزت و توقیر کی اور اسے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا، ادریسی نے ایک نقرئی کرہ ارض تیار کیا جس میں دنیا کے تمام شہروں، پہاڑوں، سمندروں، دریاؤں، وادیوں اور ان کے نشیب و فراز کا نقشہ دکھایا گیا تھا، ادریسی نے اس کرہ کی تشریح کے لیے ایک کتاب تالیف کی جس میں دنیا کے مختلف خطوں کے لوگوں کے حالات اور ان کے اطوار، وضع، لباس پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

اسی طرح نارمن فرمانرواؤں میں فریڈریک ثانی کو بھی اسلامی علوم و آداب اور عربی زبان سے خاص مناسبت تھی، اس کا دور ایک مسلمان بادشاہ کی طرح گذرا، اس نے اسلامی علوم و فنون کے ماہرین کو اپنے دربار میں خاص جگہ دی، سیر و تفریح کے اوقات میں بھی عربوں کو اپنے ساتھ رکھتا، جب جامعہ نابولی کا قیام عمل میں آیا تو اس نے اندلس، مصر، شام وغیرہ سے علماء بلا کر درس و تدریس

کے فرائض سپرد کیے، اور دنیائے اسلام سے بہت سی اہم کتابیں منگوا کر خود ان سے استفادہ کیا، اور انھیں مقامی زبانوں میں منتقل کرایا، فریڈریک ثانی جب ۱۲۴۱ء میں قاہرہ آیا تو اس کا شاندار استقبال ہوا، اکثر وہ مشکل مسائل میں افریقہ، اندلس، مصر وغیرہ کے علماء سے رجوع کرتا، وہ اپنی مادری اور لاطینی زبان کے علاوہ عربی اور یونانی میں بھی کامل دستگاہ رکھتا تھا،

غرض صقلیہ کی تاریخ ایک ایسی تمدن آفریں قوم کی سرگذشت ہے جس کی تمدنی ترقیاں یورپ کی جدید ترقیوں کی بنیادوں میں سے ایک بڑی بنیاد ہیں، بلرم میں پارچہ بافی کی صنعت درجہ کمال پر تھی، سوتی اور ریشمی ہر طرح کے کپڑے تیار کیے جاتے تھے، جو نہایت نفیس، عمدہ اور باریک ہوتے تھے، ان میں اعلیٰ قسم کے نقش و نگار بھی کاڑھے جاتے تھے، اور بازار میں یہاں کا کپڑا سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا، یورپ نے اس صنعت کو یہیں سے سیکھا،

مسلمانوں نے بحر ابیض کے ذریعہ صقلیہ کے علاوہ دوسرے جزائر بھی فتح کیے، مثلاً ۲۱۲ھ مطابق ۸۲۷ء میں عرب فوجوں نے ایک بہادر جوان ابو عمر حفص بن عیسیٰ اندلسی کی سرکردگی میں اقریطش (کریٹ) کو فتح کیا، اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک یہ جزیرہ مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں رہا، اس کے بعد اس پر ۹۶۱ء مطابق ۳۵۰ھ میں رومیوں کا قبضہ ہو گیا، اس کے علاوہ مسلمانوں نے موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس کی سرکردگی میں ۷۱۳ء میں کورسیکا، بونابرٹ اور مسقط کو فتح کیا، اور ایک صدی ۸۰۶ء تک یہ سب مقام مسلمانوں کے قبضہ میں رہے، اسی طرح مسلمانوں نے آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں سردانیہ کو فتح کر لیا، اس کے علاوہ آس پاس کے اور بھی چھوٹے چھوٹے جزیروں پر بھی وہ قابض ہو گئے، یہاں تک کہ ۲۵۵ھ میں مالٹا کو فتح کر لیا، اس کے فتح کے بعد پورے شمالی افریقہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، مصنف کتاب الجمع والبیان فی اخبار القیروان لکھتا ہے کہ مالٹا ابو الغرانین محمد بن احمد بن اغلب المتوفی ۲۷۱ھ کے دور میں فتح ہوا تھا، اس کا

لقب غرانیق اس مناسبت سے پڑ گیا تھا کہ وہ شکار کا بڑا شیدائی تھا، اس لقب کے بارے میں ایک بات یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے ایک وادی میں غرانیق (آبی سیاہ پرندہ) کے شکار کے لیے ایک شکارگاہ تیس ہزار دینار میں تعمیر کرائی تھی، اس مناسبت سے اس کا لقب بھی غرانیق پڑ گیا، مالٹا کی فتح کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ اغلبی فرمانرواؤں کے دور میں فتح ہوا تھا، انھوں نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ اس سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے، مالٹا کی عام بول چال کی زبان بگڑی ہوئی عربی تھی، بعض مورخین کی رائے ہے کہ وہاں کے قدیم باشندے فنیقی تھے، جب نابلی اس جزیرہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے بارہ سو توپیں، دو لاکھ رطل بارود، چالیس ہزار بندوقیں اور چار ہزار پانچسو مسلمان قیدی پائے، ۱۷۹۸ء میں ان قیدیوں نے رہائی حاصل کی،

مسلمانوں نے جزیرہ قبرص کو بھی فتح کر لیا تھا، اس وقت یہ جزیرہ دو حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ میں مسلمان اور دوسرے حصہ میں عیسائی آباد ہیں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں کافی روابط ہیں، ابن حوقل جزیرہ قبرص اور جزیرہ اقریطش (کریٹ) کے بارے میں لکھتا ہے کہ "دونوں جزیرے نہایت سرسبز و شاداب اور دولت سے مالا مال ہیں، ان جزیروں کے حاکم مسلمان ہیں"، ابن جبیر اندلسی اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ جب اس نے کریٹ کا سفر کیا تو اس وقت اس جزیرہ کا حاکم ابو القاسم بن حمود الملقب ابن حجر تھا، وہ بڑا صاحب خیر و فضل تھا، غربا کی اعانت، حاجیوں کی نگہداشت، قیدیوں کو آزاد کرانا اس کا خاص مشغلہ تھا، اس کا تعلق اہل بیت سے تھا، اس خاندان میں امارت و سیادت قدیم زمانہ سے چلی آرہی تھی،

اسی زمانہ میں مسلمانوں نے روڈس بھی فتح کیا تھا، اس کی فتح کے بارے میں بلاذری فتوح البلدان میں لکھتا ہے کہ "مسلمان روڈس میں سات سال تک اس قلعہ میں مقیم رہے جو خود انھوں نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا، حضرت امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید نے جنادہ کو حکم دیا کہ

قلعہ مسمار کر دیا جائے، مجاہد بن جبیر نے اس قلعہ میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی تھی، اور وہ لوگوں کو قرآن پڑھایا کرتے تھے"

جنادہ بن ابی امیہ نے ۵۴ھ میں ارواڈ کو فتح کیا، ارواڈ قسطنطنیہ کے قریب ایک جزیرہ ہے، جہاں حضرت امیر معاویہؓ کے حکم سے ان مجاہدین نے مستقلاً سکونت اختیار کر لی جو اس کی جنگی مہم میں شامل تھے، ان ہی میں مجاہد اور تبیع بھی تھے، تبیع کعب الاحبارؓ کی بیوی کے پہلے شوہر کے لڑکے تھے، یہیں مجاہد نے تبیع کو قرآن پڑھایا، بعض مورخین کا خیال ہے کہ انھوں نے روڈس ہی میں قرآن پڑھایا تھا،

روڈس میں اس وقت بھی کافی مسلمان آباد ہیں، وہاں کے مفتی اور امام شیخ سلیمان کاشلی ہیں، ۱۹۴۰ء میں یونانی مسلمانوں اور اٹلی میں ایک شدید جنگ ہوئی تھی جس میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے، لیکن اس جنگ میں عظیم نقصان کے باوجود مسلمانوں نے نصف البانیہ فتح کر لیا، یونان ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک خانہ جنگی میں مبتلا رہا جس کی وجہ سے تقریباً ایک لاکھ انسانوں کی جانیں ضائع ہو گئیں،

اس وقت یونان اور اس کے ارد گرد تقریباً ایک لاکھ مسلمان آباد ہیں، جن میں زیادہ تر کاشتکار ہیں، یہ لوگ زیادہ تر یونان کے پایہ تخت اور مغربی خطوں میں ہیں، مسلمانوں کو اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے دین کی نشر و اشاعت میں حکومت یونان کی طرف سے پوری آزادی حاصل ہے، اسلامی مدارس کی تعمیر میں بھی حکومت پورے طور سے دلچسپی لیتی ہے اور مستقل امداد دیتی ہے، گذشتہ سال یونانی زبان میں قرآن کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے،

روڈب بلقان کی کل آبادی ۳۵ ہزار ہے، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، یونان میں حقیقی جمہوری نظام ہے، اور ہر شخص کو مکمل آزادی اور اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے پورے حقوق حاصل ہیں،

مسلمان آزادانہ طور پر مساجد تعمیر کرتے ہیں، اور اس میں حکومت بھی ان کی امداد کرتی ہے، قرآن کی تعلیم کا عام رواج ہے، جو زیادہ تر حفظ پر مشتمل ہے، بلقان کے حالات و مشاہدات کے بعد اسکی ضرورت ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں عام دینی و تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے مختلف ممالک کے تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل وفود روانہ کیے جائیں۔

عرب کے بیس ماہی گیر اسپین کے ساحل کے ذریعہ پروفانس پہنچے، اور مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ساتھ فرکسینا ٹوم پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا، اس قلعہ کے جائے وقوع کے بارے میں مورخین کی رائیں مختلف ہیں لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ فرانس اور اٹلی کے درمیان میں کوہستان الپ میں واقع تھا، مسلمانوں نے آہستہ آہستہ یہاں زبردست قوت حاصل کرلی، یہانتک کہ ۹۰۶ء میں ڈوفینی کی تمام گھاٹیوں پر قبضہ کرلیا جس سے اٹلی اور فرانس کا مواصلاتی اور ثقافتی و تجارتی راستہ منقطع ہوگیا، مسلمانوں کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی شخص ان گھاٹیوں کو عبور نہیں کرسکتا تھا، ۹۱۱ء میں رئیس اساقفہ کو بھی روم جانے کے لیے ان مسلمانوں سے اجازت لینی پڑی، پروفانس میں آباد اساقفہ مسلمانوں کے خوف سے پروفانس چھوڑ کر سوئزرلینڈ کے علاقہ میں آباد ہوگئے، مگر مسلمانوں نے ان کو یہاں بھی دم نہ لینے دیا، اور اس علاقہ کو بھی فتح کرلیا۔

فرانس میں نیس (ادنیقہ) بھی عرصہ تک مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں رہا، ڈوزانٹ تاریخ میں لکھتا ہے کہ "نیس میں ایک پورا محلہ مسلمانوں سے آباد تھا"،

یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، جس کا اصل مقصد اپنی حفاظت اور ملک کی سالمیت تھا، یورپ کی فتوحات کے سلسلہ میں مجاہدین کے حوصلے اس لیے بھی بلند تھے کہ حدیث نبوی میں اس کے فتح کی پیشین گوئی موجود ہے، وہ حدیث یہ ہے:

زویت لی مشارق الارض	میرے لئے مشرق سے مغرب تک زمین

ومغاربها وسیبلغ ملک امتی	لپیٹ دی گئی اور عنقریب ان تمام علاقوں
ما زوی لی منها (رواہ مسلم و احمد و نسائی)	پر میری امت کا قبضہ ہوگا۔

دوسری سند سے یہ روایت اس سے زیادہ مفصل طور پر یوں مروی ہے:-

حدثنا حماد عن ایوب عن ابی	حماد ایوب سے اور وہ ابو قلابہ سے اور
قلابۃ عن ابی اسماء عن ثوبان	وہ ابو اسماء سے اور وہ ثوبان سے
قال قال رسول اللہ صلی اللہ	روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ان اللہ زوی لی الارض	علیہ وسلم نے کہ خدا نے میرے لیے زمین لپیٹ
فرأیت مشارقها ومغاربها	دی، میں نے اس کو مشرق سے مغرب تک دیکھا
وان امتی سیبلغ ملکها ما زوی لی	اور عنقریب میری امت ان تمام علاقوں
منها واعطیت الکنزین الاحمر	کی مالک ہوگی، اور مجھے دو خزانے احمر و ابیض
والابیض وانی سألت ربی	دیے گئے، میں نے اپنے پروردگار سے درخواست
لامتی ان لا یهلکها بسنة عامة	کی کہ میری امت کو خشک سالی سے ہلاک
وان لا یسلط علیهم عدوا	نہ کریگا، اور دوسری قوم کو ان پر مسلط نہ کریگا،
من سوی انفسهم فیستبیح بیضتهم	جو ان کی سرزمین پر تصرف کرے، میرے پروردگار
وان ربی قال یا محمد انی اذا قضیت	نے کہا اے محمد میں نے بعض فیصلے ایسے کیے ہیں
قضاء فانه لا یرد وانی اعطیتک	جن میں کبھی رد و بدل نہیں ہو سکتا، (ان
لامتک ان لا اهلکهم بسنة عامة	میں سے ایک یہ ہے) میں تمھاری امت کو
وان لا یسلط علیهم عدوا من	خشک سالی سے تباہ نہ کروں گا، ان پر
سوی انفسهم یستبیح بیضتهم	کسی دوسری قوم کو مسلط نہ کرونگا جو انکی

ولو اجتمع علیہم من اقطارھا او قال من
بین اقطارھا حتی یکون بعضھم یہلک
بعضا ویسبی بعضھم بعضا

سرزمین پر تصرف کرے، اگرچہ اس کے لیے
ساری دنیا کے لوگ جمع ہو جائیں یہاں تک کہ
وہ آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک اور قید کرنے لگیں گے.

یورپ میں اسلام کی نشر و اشاعت میں ان فتوحات کے علاوہ مسلمان سیاحوں، تاجروں اور داعیوں کا بھی بڑا دخل ہے، تاریخ کی قدیم عربی کتابوں میں یورپ کے بعض خطوں اور وہاں سے تجارتی و ثقافتی روابط کا تذکرہ اکثر ملتا ہے، مثلاً مقدسی نے مسعودی (سنہ ۳۴۶ھ / ۹۵۶ء) کے حوالہ سے احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ یورپ میں ایک قبیلہ سلافیہ کے نام سے مشہور ہے، اس قبیلہ میں کثرت سے مسلمان تھے،

بحر اڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر ڈالمیا جو آج کے جدید یوگوسلاویہ کے زیر حکومت ہے، پہلے یہاں قبیلہ صقالبہ آباد تھا، اس خطہ پر مسلمانوں کے قبضہ سے پہلے بھی یہاں کے باشندوں کے عربی ممالک سے تجارتی و ثقافتی تعلقات تھے، صقلبیوں کا تذکرہ تاریخ کی اکثر کتابوں میں ملتا ہے، ابن جریر تاریخ طبری میں لکھتے ہیں کہ "مامون کے حکم سے جن چار غلاموں نے وزیر فضل بن سہل کو قتل کیا تھا، ان میں ایک کا نام موفق الصقلبی تھا، یتیمۃ الدہر میں ہے کہ "عرب صقلبی اور ترکی غلاموں میں صقلبی غلاموں کو ترجیح دیتے تھے۔" جاحظ کتاب الحیوان میں غلاموں کے اقسام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "صقالبہ سفید حمام کے مانند ہوتے تھے،" مسعودی لکھتا ہے کہ خلیفہ مستعین عباسی کی ماں صقلبی تھی، اور اسکا نام مخارق تھا، مشہور مورخ ابو الفداء اشقراد کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا قبیلہ ہے، جو جرمنی اور انگلینڈ کے درمیان میں آباد ہے، یہ قبیلہ عیسائیوں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے، مگر عیسائیوں کو اکثریت اور غلبہ حاصل ہے، یہاں کے آباد مسلمان ذمیوں کی طرح جزیہ دیتے ہیں، یاقوت حموی معجم البلدان میں باشقارد کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں نے حلب میں بہت سے

ایسے لوگ پائے جن کو لوگ باشغاردیہ کہتے ہیں، کیونکہ ان کے بال اور چہرے بے انتہا سفید ہوتے ہیں اور وہ امام ابو حنیفہ کے مسلک کے پیرو ہیں، میں نے ان میں سے ایک سمجھ دار آدمی سے اس کے حسب نسب کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ ہم قسطنطنیہ سے کچھ دور ہنگری کے رہنے والے ہیں جو انگریزوں کے ماتحت ایک علاقہ ہے، مگر مذہباً ہم مسلمان ہیں، ہمارا ظاہری رہن سہن انگریزوں سے ملتا جلتا ہے، ہم میں زیادہ تر لوگ فوج میں ملازم ہیں، میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اتنے دور دراز ملک میں اسلام کیسے پہنچا، اس نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ بلغاریہ سے سات افراد پر مشتمل مسلمانوں کی ایک جماعت یہاں آکر آباد ہوگئی، اس نے ہمیں ہدایت کی دعوت دی جس سے متاثر ہو کر ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا، اور خدا کا یہ فضل ہے کہ اس نے اب تک ہماری نسل میں اسلام کو باقی رکھا، چونکہ ہمارے یہاں تعلیم کا باقاعدہ نظام نہیں ہے، اس لیے ہم تعلیم کے لیے عرب کے اسلامی ملکوں کا سفر کرتے ہیں، اور حصول تعلیم کے بعد لوٹ کر اپنے ملک میں دین و اسلام کی خدمت کرتے ہیں، میں نے اس سے یہ بھی سوال کیا کہ تم لوگ داڑھی کیوں منڈاتے ہو، اس نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں داڑھی رکھنے کا رواج عام ہے، البتہ نوجوان طبقہ اور فوجوں میں ملازمت کرنے والے داڑھی نہیں رکھتے، میں نے اس سے اس کے ملک کی مسافت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ یہاں سے قسطنطنیہ ڈیڑھ ماہ کی مسافت پر ہے اور اتنی ہی مسافت قسطنطنیہ سے ہمارے ملک کی ہے،

غرض تجارتی و ثقافتی تعلقات اور اسلامی فتوحات کے ذریعہ یورپ کے جنوب مشرق کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی آبادیاں قائم ہوگئی تھیں، کہیں مسلمان حاکم تھے اور کہیں محکوم، یورپ میں مسلمانوں پر بڑے بڑے مظالم بھی ہوئے، مگر انھوں نے ان کو اسلام کی راہ میں بڑے صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا، مثلاً کارل اول رابرٹ (سنہ ۱۳۱۰ء تا سنہ ۱۳۴۲ء) نے اپنے مقبوضہ علاقے میں

یہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ کوئی شخص روزہ نہیں رکھ سکتا، ذبیحہ صرف مسیحی طرز پر ہوگا، خنزیر کا گوشت نہ کھانا جرم متصور ہوگا، کوئی شخص نماز سے پہلے وضو نہیں کر سکتا، مسلمانوں کی وراثت میں حکومت بھی حصہ دار ہوگی، اس کے دور حکومت میں مسلمانوں پر ناروا مظالم کی ایک طویل داستان ہے، اس کے پورے دور میں مسلمانوں کو سخت مشکلات کا سامنا رہا، اس کے مرنے کے بعد مسلمانوں کو قدرے سکون حاصل ہوا، مگر اس کے باوجود ہنگری کے مسلمانوں کی زندگی ہمیشہ مصائب کا شکار رہی، اور اس وقت بھی وہاں کے مسلمان سخت مشکلات میں زندگی کا مقابلہ کر رہے ہیں،

یوگوسلاویہ میں مسلمان پہلی ہی صدی سے آباد ہیں، قبیلہ سنجاک اور بشناق میں کثرت سے مسلمان ہیں، ابھی حال ہی میں ایک سیاح نے بسنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ یورپ میں یوگوسلاویہ ہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے مسلمانوں نے مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار نہیں کیا، وہ اس بارہ میں قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کے نرغے میں رہنے کے باوجود اسلامی طرز معاشرت نہیں چھوڑا، اسلامی طرز معاشرت میں مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں سے فائق ہیں، وہاں کے پہاڑی علاقہ کے بعض مسلم گھرانوں کو دیکھنے کا موقع ملا، ان کے رہن سہن کو دیکھکر قرن اول کے مسلمان یاد آجاتے ہیں،

۱۳۶۳ء سے قبل بسنہ میں ترکوں کی آمد کا پتہ چلتا ہے، اس سے پہلے وہاں اسلام کے پھیلنے کا موقع کم ملا، ۱۳۶۳ء کی فتح اور ۱۸۸۶ء میں قبیلہ بلج کے اسلام لانے کے بعد بسنہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی، وہاں کے باشندے عرصہ تک سکون و اطمینان کی زندگی گذارتے رہے، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں کچھ فتنہ پروروں نے سر ابھارا، بلغاریہ، اور جبل اسود کے باشندوں میں یہ فتنہ پھیلایا کہ اسلام میں مسیحیوں کا قتل مباح اور باعث ثواب ہے، ان فتنہ پروروں نے اس سلسلہ میں سلانیک میں جرمنی اور فرانس کے سفیروں کے قتل کو بہانا بنایا، جس سے وہاں کے مسیحی عوام بھڑک اٹھے اور بسنہ اور ہرسک نے باغیوں نے یہ مطالبہ کیا کہ انھیں حکومت کے مقبوضہ علاقے سے الگ

آزاد ریاست کے طور پر حصہ دیا جائے، اس نامنحوس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر باغیوں اور ترکی حکومت میں عارضی صلح کرا دی، اس طرح روس کو ان علاقوں میں قدم جمانے اور اپنا سیاسی مسلک کی اشاعت کا کافی موقع ملا، اور وسط یورپ کے اکثر خطوں میں اس کو غلبہ اور تسلط حاصل ہو گیا،

یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کو ہر طرح کی مذہبی اور شخصی آزادی اور وہاں کے وفاقی دستور میں مسلمانوں کو پورے مراعات حاصل ہیں، چونکہ وہاں کی حکومت سیکولر ہے اس لیے مسلمان اپنے مذہبی امور و معاملات کا انتظام خود کرتے ہیں، سراجیفو میں باقاعدہ علماء کی ایک مجلس ہے، جو دینی امور کی نگراں ہے، اس مجلس کا باقاعدہ انتخاب ہوتا ہے، اس انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ منتخب نمائندوں میں ایک تہائی عالم دین ہوں، اور بقیہ نمائندے بھی دیندار ہوں، پورے یوگوسلاویہ میں اس وقت تقریباً آٹھ ہزار مسجدیں ہیں، خاص سراجیفو میں کئی اعلیٰ اسلامی درسگاہیں اور بہت ثانوی و ابتدائی مکاتیب ہیں، وہاں کے مسلمان ملک کی عوامی اور سیاسی زندگی میں برابر کے شریک ہیں، مثلاً عثمان کرہیونفتش یوگوسلاویہ کے وزیر اتحادی اور حسن ہیرکتش وزیر تجارت ہیں، ایک مسلمان خاتون عدالت العالیہ کی جج ہیں، بلغراد میں ایک عالم دین شیخ الاسلام کے منصب پر مقرر ہوتا ہے، اس کا انتخاب مجلس العلماء، اصحاب افتا، مدرسہ قضا و شرعی کا نگران اور محکمہ اوقاف کے منتخب ارکان کرتے ہیں،

مجلس نواب میں مسلمانوں کے تیس منتخب شدہ نمائندے ہوتے ہیں، جو مجلس العلماء، اور محکمۃ التمیز سے منتخب ہوتے ہیں، یہ نمائندے مسلمانوں کے دینی معاملات، اوقاف اور تعلیم وغیرہ کی نگرانی کرتے ہیں، ہر علاقہ میں قضاۃ مقرر ہوتے ہیں، جو نکاح، طلاق، میراث اور اوقاف وغیرہ کے مقدمات فیصل کرتے ہیں، بوسنہ میں ان تمام مجالس کی نگرانی کے لیے ایک الگ محکمہ قائم ہے جو محکمۃ التمیز کے نام سے موسوم ہے، دو اعلیٰ درسگاہیں "مدرسہ قضا و شرعی" اور "مدرسہ علوم شرعی" قائم ہیں، ان کے علاوہ دوسرے مدارس سے فارغین اور مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ

دو ٹیچر ٹریننگ اسکول قائم ہیں،

البانیہ میں اسلام کی اشاعت ترکوں کے ذریعہ ہوئی، ترکوں کے فتح بلقان کے بعد البانیون نے جارج کسٹر یوٹ بن یوحنا کی سرکردگی میں سخت مقابلہ کیا، اس معرکہ میں بھی ترکوں کو فتح ہوئی اور اس کے بعد جارج نے اسلام قبول کرلیا، اور عثمانی لشکر میں جنرل مقرر ہوا، اس کا اسلامی نام اسکندر بک ہوا،

البانیہ کی کل آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے، جس میں نصف مسلمان ہیں، اور نصف آبادی میں ارتھوڈکس اور رومن کیتھولک عیسائی ہیں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی عام معاشرت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، یہاں عیسائی بھی ترکی ٹوپی استعمال کرتے ہیں، اور اپنے مدارس میں قرآن پڑھاتے ہیں، البانیہ میں سب سے مشہور اسلامی درسگاہ مدرسہ تیرانا ہے، جس میں عربی اور علوم شرعیہ کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہے، البتہ ابھی تک اس درسگاہ میں ذریعہ تعلیم البانی زبان ہی ہے، اس درسگاہ میں البانیہ کے علاوہ مختلف مقامات باسان، داشکودرا، کورتسا دو، رازد اور فلورا کے تقریباً ۳۰۰ طلباء تعلیم حاصل کررہے ہیں، اس درسگاہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مفتی، ائمہ، خطباء اور اسلامی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کیے جائیں۔

جرمنی میں مسلمانوں کی کل تعداد تقریباً ۹ ہزار ہے جن میں تین ہزار خاص جرمن باشندے ہیں اور ۶ ہزار میں عرب، ہندوستان، پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں کے باشندے شامل ہیں، جرمنی میں مسلمانوں کو دینی اور تعلیمی ہر طرح کی آزادی حاصل ہے، 'یہ ہ' میں بہت سی اسلامی جماعتیں دینی کام کررہی ہیں، ان میں ایک اسلامی جماعت کا نام جمعیۃ الاخوۃ الاسلامیہ ہے، اس کے امیر سید احمد ہارون ہیں، فرانکفورٹ کی اسلامی جماعت کے امیر ایک جرمن نومسلم محمد امین ہیں، ہیمبرج میں بھی ایک اسلامی جماعت قائم ہے، جس کے امیر برلن کے امام محمد امان ہیں، جو کئی کتابوں

کے مصنف ہیں، انھوں نے عام فائدے کی غرض سے جرمن زبان میں نماز کی ترکیب پر ایک مصور کتاب شائع کی ہے، محمد امان اور ان کے دست راست سید محمد احمد نے جرمن باشندوں میں اسلام کی اشاعت اور اس کو عام فہم بنانے میں انتھک کوشش کی ہے،

جرمنی کے مسلمانوں کے علمی اور ثقافتی روابط سوئزرلینڈ، آسٹریلیا، ہالینڈ، فن لینڈ اور سوڈان کے مسلمانوں سے قائم ہیں، ابھی حال ہی میں جرمن زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے،

فرانس میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تقریباً دو لاکھ ہے، جن میں بیس ہزار پیرس اور اس کے گردونواح میں آباد ہیں، ان میں زیادہ تر شمالی افریقہ کے لوگ ہیں، یہاں کے مسلمان زیادہ تر مزدور پیشہ ہیں،

مرسلیز میں ایک مسلم مسافر خانہ ایک مسلمان خاتون کی نگرانی میں قائم ہے جس میں نو وارد مسلمانوں کے قیام وطعام کا باقاعدہ انتظام ہے، خاص پیرس میں ۱۵ جولائی ۱۹۲۶ء میں ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد رکھی گئی تھی، اس میں دینی جلسوں کے لیے ایک وسیع ہال بھی تعمیر کیا گیا ہے، یہ مسجد شرقی اور مغربی طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس کے صحن میں خوش منظر حوض ہے، جس میں ایک خوشنما فوارہ مسجد کے حسن و وقار کو دوبالا کرتا ہے، فرانس میں بہت سی دینی جماعتیں بھی قائم ہیں، مثلاً ایک جماعت "جمعیۃ الاخوۃ الاسلامیہ" کے نام سے قائم ہے، جس کا بنیادی مقصد مدارس اور یونیورسٹیوں کے فارغ طلبا کی دینی تربیت ہے، اس جماعت کے ایک سرگرم کارکن استاد مسعود دینی ہیں جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حج پر جامع کتابیں لکھی ہیں،

انگلینڈ میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تقریباً تیس ہزار ہے، یہاں کی اسلامی تاریخ ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتی ہے، اگرچہ اس سنہ سے پہلے بھی اسلامی دعاۃ انگلینڈ پہنچ چکے ہیں، لیکن ان کے

کاموں کو شہرت نہ حاصل ہو سکی، یہاں تک کہ ترکی میں انگلینڈ کے مشہور سفیر لارڈ اسٹانلی آف درلی نے اسلام قبول کر لیا، ان کا اسلامی نام عبد الرحمٰن تھا، انھوں نے قبول اسلام کے بعد انگلینڈ میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں انتہائی جد و جہد کی، ان کی کوشش سے ایک اچھے خاصے طبقے نے اسلام قبول کر لیا، اس سے چند سال پہلے ۱۸۶۶ء میں مسٹر کو بلیام نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، وہ لوزپول کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کا اسلامی نام عبد الرحمٰن تھا، سلطان عبد الحمید نے ان کی خدمات و کارہائے نمایاں سے متاثر ہو کر اپنے یہاں بلا لیا، اور ایک خطاب عطا کر کے برطانیہ میں شیخ الاسلام کا منصب تفویض کیا، وہاں کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد موصوف اپنے وطن لوزپول واپس آ گئے، اور آنے کے بعد اپنے گھر کو مسجد قرار دیا، جو اسلامی تہذیب و ثقافت کے شیدائیوں کا مرکز بن گئی، موصوف نے دو اسلامی رسالوں کا اجرا بھی کیا، جس میں اسلامی علوم اور اسلامی تعلیمات کو اچھے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا جاتا تھا، اس کو پڑھ کر شمالی انگلینڈ میں بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا، اور ایک اچھا خاصہ طبقہ اسلام سے واقف ہو گیا،

۱۸۸۶ء میں ایک اور اسلامی جماعت قائم ہوئی جس نے تقریباً سترہ سال تک اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خدمت انجام دی، اس جماعت کے امیر شیخ عبد اللہ سہروردی تھے، اسی درمیان میں ہندوستان سے بھی بہت سے مبلغین اسلام انگلینڈ پہنچے، ان میں فاتح محمد سیال اور خواجہ کمال الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات کی مساعی کا یہ اثر ہوا کہ مشہور انگریز لارڈ ہیڈ لے نے اسلام قبول کر لیا، انھوں نے انگلینڈ میں ایک اسلامی جماعت کی بنیاد ڈالی، جو "الجمعیۃ الغربیۃ الاسلامیۃ" کے نام سے مشہور ہوئی، اس کے امیر ڈاکٹر خالد شلدریک مقرر ہوئے، اس جماعت کا اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ عرب، ہندوستان، ملایا اور صومال وغیرہ کے ان مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے جو انگریزی کمپنیوں میں کام کرتے ہیں، اس کے علاوہ

پریشان حال مسلمانوں کی اعانت، مدارس و مساجد کا قیام اور ان کی نگرانی، مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت اس کے مقاصد میں تھی، ان ہی بنیادوں پر بیسویں صدی کے ربع اول میں بھی نو مسلم انگریزوں، ہندوستانی مسلمانوں اور عرب ملکوں کے مسلمانوں نے مل کر ایک اور جماعت کی بنیاد ڈالی،

مانچسٹر میں ایک اسلامی مرکز قائم ہے، جہاں مسلمانوں کے نکاح اور دیگر اسلامی شعائر کی دیکھ بھال کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے، اس مرکز سے متعلق نماز، مذہبی تقریروں اور عام جلسوں کے لیے الگ الگ ہال ہیں، مرکز کے اوپر کی دو منزلیں شادی شدہ مسلمان طلبا کی رہائش کے لیے مخصوص ہیں، اس وقت مانچسٹر اور اس کے آس پاس میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تقریباً تین سو ہے، اسلامی مرکز میں ہر ہفتہ میں ایک دن اسلامی تعلیمات پر تقریر اور ایک دن عام مسلمانوں کی تعمیری ترقی کے لیے غور و خوض ہوتا ہے، مانچسٹر یونیورسٹی اور اس سے متعلق صنعتی شعبوں میں مسلمان طلبا کو تعلیم کی پوری سہولت حاصل ہے، مانچسٹر میں ایک صاحب خیر اور مشہور تاجر لبابیدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو ریشمی اور سوتی کپڑوں کی تجارت کرتے ہیں، ان کی تجارتی ایجنسیاں شرق اوسط، مشرقی افریقہ، مغرب، سنگال، پاکستان، ہندوستان، جنوبی افریقہ وغیرہ میں قائم ہیں،

کارڈیف کے ایک حصہ میں یمن، عدن اور صومال کے مسلمان باشندے آکر آباد ہو گئے ہیں، جن کی مجموعی تعداد تقریباً ۱۵۰۰ ہے، ان میں صرف صومال کے ۶۰۰ سو مسلمان ہیں، ان صومالی مسلمانوں نے اپنی الگ ایک اسلامی جماعت "جمعیۃ شباب الصومال" قائم کی ہے، خاص کارڈیف میں بہت سے ہوٹل، کافی ہاؤس، ریسٹورنٹ کے مالک عرب ہیں، اس کے علاوہ بہت سے عربوں نے سبزی، پھلوں اور گوشت وغیرہ کی دکانیں کھول لی ہیں، یہاں مسلمانوں کو

ہر قسم کی تجارتی اور کاروباری سہولتیں حاصل ہیں، ان میں اور وہاں کے مقامی باشندوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے، ان تاجروں میں صومال کے ایک عربی تاجر سید محمد عمر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو کاروباری حیثیت سے وہاں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

کارڈیف کی جماعت نور الاسلام نے خاص کارڈیف میں ایک مسجد "مسجد نور الاسلام" کے نام سے تعمیر کی ہے، اس جماعت نے کارڈیف میں تین اور شیلڈز میں ایک مکان خرید کر مسجد پر وقف کیا ہے، کارڈیف کے مسلمانوں نے ایک مسافر خانہ بھی تعمیر کیا ہے، اور اس سے متعلق ایک دینی مدرسہ بھی ہے جس کے تمام تعلیمی مصارف ایک صاحب خیر سید علی سلمان زبیدی برداشت کرتے ہیں، حال ہی میں کارڈیف کے مسلمانوں نے ایک جامع مسجد کی تعمیر کے انتظامات شروع کر دیے ہیں،

لندن سے ۲۸ میل دور وکنگ میں بھی ایک مسجد ہے، یہ مسجد عرصہ ہوا ہندوستانی مسلمانوں کے چندوں سے تعمیر ہوئی تھی، اور اس کے تمام بالائی مصارف کی کفالت بیگم بھوپال کرتی تھیں، اسی مناسبت سے اس مسجد کا نام مسجد شاہجہانی ہے، خاص لندن میں ایک اسلامی مرکز قائم ہے، خدا اس دینی مرکز کو اور انگلینڈ کے دیگر مراکز کو مزید ترقی عطا فرمائے۔

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور پھر یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ (از شاہ معین الدین احمد ندوی) قیمت ۸/ روپے

منیجر

فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ

(جامع مسجد بُرہان پور)

از جناب جاوید انصاری، برہان پور

برہان پور جنوبی ہند کا قدیم تاریخی شہر ہے، جس کو نصیر خاں فاروقی نے اپنے پیر و مرشد شیخ برہان الدین غریب کے نام پر ۸۰۰ھ میں آباد کیا تھا، سلاطین فاروقیہ نے اس شہر کو صوبہ خاندیش کا پایہ تخت بنا کر دو سو سال حکومت کی، اور اپنے عہد میں یہاں کئی شاندار عمارتیں بنوائیں، جن میں شاہی قلعہ کی عمارتیں، شاہان فاروقیہ کے مقبرے، ببر بنا صاحب کی مسجد، بی بی کی مسجد، شاہ باجن کی مسجد، عیدگاہ قدیم، جامع مسجد اسیر گڑھ اور جامع مسجد برہان پور خاص طور سے قابل ذکر ہیں، فاروقی دور کی اکثر عمارتیں پتھر کی ہیں، اگرچہ یہ ہندوستان کی عمارتوں کی طرح بلند و بالا نہیں ہیں لیکن اپنے دور کی سنگ تراشی اور صناعی کا نادر نمونہ ہیں، فاروقیہ عہد کی عمارتوں کی بنیادیں گہری اور دیواروں کے آثار چوڑے ہیں، اس لیے صدیاں گذر جانے کے باوجود ان میں مرمت کی بہت کم ضرورت پیش آئی، پیش نظر مضمون میں برہان پور کی تاریخی جامع مسجد کا حال تحریر کیا گیا ہے، جو اپنی ساخت اور فن تعمیر کے اعتبار سے نہ صرف دکن بلکہ تمام ہندوستان میں اپنی مثال آپ ہے، اس مسجد کی صناعی اور ندرت کا اعتراف عہد مغلیہ کے مورخوں نے بھی کیا ہے، اور اسے خطۂ دکن کی بہترین عمارت قرار دیا ہے، چنانچہ مصنف مآثر رحیمی لکھتا ہے:

"مسجد جامع ایں شہر عمارتے ست عالی و بنا ہے متعالی و از آثار عجیبۂ غریبہ کہ دریں ولایت ہست بہتر ازیں عالی بنا چیزے نیست" (ص ۶۰۲ جلد دوم)

مشہور مورخ خافی خاں نے اس مسجد کو کاریگری اور نقاشی کے لحاظ سے جامع مسجد دہلی کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"بہ خوبی مسجد برہان پور سوائے مسجد شاہجہان آباد کمتر مسجد بہ نظر آمدہ" (منتخب اللباب جلد سوم ص ۴۳۲)

اس جامع مسجد کو صوبہ خاندیش کے خود مختار فرمانروا عادل شاہ بن مبارک شاہ فاروقی نے تعمیر کرایا تھا جس کا اصلی نام راجہ علی خاں تھا، وہ ۹۸۴ھ میں برہان پور میں تخت نشین ہوا، اور ۱۰۰۸ھ میں وفات پائی، بادشاہ مذکور متقی اور پابند صوم و صلوٰۃ تھا،

برہان پور کی قدیم جامع مسجد پہلے وہ تھی جو اب محلہ اتوارہ میں بی بی کی مسجد کہلاتی ہے، یہ مسجد اس شہر کی ملکہ راجہ رقیہ بیگم نے بنوائی تھی، اس کا سنہ تعمیر ۹۳۶ھ ہے جب شہر کی آبادی شمال سے جنوب کی طرف بڑھنے لگی تو یہ مسجد کنارے پڑ گئی، جس سے جمعہ کے دن نمازیوں کو آنے میں تکلیف ہوتی تھی، اس لیے بادشاہ نے شہر کے بالکل وسط میں ایک جامع مسجد بنانے کا حکم دیا،

اس مسجد کا سنگ بنیاد ۹۹۷ھ میں رکھا گیا، اور ۱۰۰۲ھ میں تعمیر ختم ہوئی یعنی پانچ سال کے عرصے میں یہ عالیشان عمارت بنکر تیار ہوئی، تاریخ برہان پور میں تعمیر مسجد کا جو قطعۂ تاریخ درج ہے، اس میں ایک ہی مصرع میں تعمیر کی ابتدا اور تکمیل کا سنہ دونوں تحریر کئے ہیں، مسجد کی وسطی محراب میں جو عربی کتبہ ہے اس میں ابتدائے تعمیر کا سنہ ۹۹۷ھ تحریر ہے، لیکن تکمیل کا کسی وجہ سے کندہ نہ ہو سکا، جس سے بعض لوگوں نے یہ غلط رائے قائم کرلی کہ تعمیر اور تکمیل کا ایک ہی سنہ ہے، یعنی مسجد ایک سال میں بنی ہے، حالانکہ اسیر گڑھ کی مسجد کی تعمیر میں

جو اسی نمونے کی ہے، اور اس سے طول و عرض میں کم ہے، تقریباً چار سال صرف ہوئے تو اتنی بڑی عمارت کا ایک سال میں مکمل ہونا کس طرح ممکن ہے، اس لیے قطعۂ تاریخ ہی درست ہے جو حسب ذیل ہے:-

شاہ عادل خلف شاہ مبارک فاروق — بسلاطین جہاں بود وجودے کامل
مسجدے ساختہ از مال مزکی بے شک — کہ زبان ست بتوصیف و ثنائش عاطل
بہ برہانپور ازیں مسجد رونق افزا — می شود شام و سحر رحمت ایزد نازل
خوش دو تاریخ خرد گفت دریں یک مصرع — مسجد فیض بنا گشت بہ فیض عادل
۹۹۷ھ — ۱۰۰۲ھ

مسجد کا محل وقوع جامع مسجد دہلی کی طرح بالکل وسط شہر میں ہے، اس کے چاروں طرف چوک بازار کی دوکانیں ہیں، جہاں بڑی چہل پہل رہتی ہے، مسجد کے مشرقی جانب صدر دروازہ ہے، اندر ایک وسیع احاطہ اور پختہ سنگین صحن ہے، جسے طے کرکے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، پوری عمارت نیچے سے اوپر تک سفیدی مائل سیاہ پتھر کی ہے، اندرونی حصے میں پالش کیا ہوا چمکیلا پتھر استعمال کیا گیا ہے، مسجد کی ساخت محرابی طرز (آرچ سسٹم) پر ہے، سامنے کے رُخ ۱۵ در ہیں،

پیمائش مسجد کا طول اندر سے ۱۴۸ فیٹ اور عرض ۵۲ فیٹ ہے، ہر دیوار کا آثار ۵ فٹ اسکے علاوہ ہے، چھت کی بلندی ۱۵ فٹ ہے، جو ۷۰ چوکور ستونوں پر قائم ہے، ہر ستون کا حجم ۱½ × ۱½ فٹ اور اونچائی ۵½ فیٹ ہے، یہ ستون منقش کرسیوں پر قائم ہیں، کئی ستون تو ایک ہی سالم پتھر کو تراش کر بنائے گئے ہیں، جہاں دو پتھروں کو جوڑا گیا ہے وہاں ذرا بھی شگاف دکھائی نہیں دیتا، نہ جوڑ یا مسالہ نظر آتا ہے، مسجد کے طول میں ۱۵ دالان اور عرض میں ۵ دالان ہیں، شمالی جنوبی دیواروں میں ہر دالان کے سرے پر تقریباً، فٹ اونچے محرابی روشندان ہیں۔

اور صنعت جامع مسجد کی چھت دوسری مساجد کی طرح گنبد دار نہیں بلکہ اوپر سے ہموار اور نیچے سے محرابی ہے، اندر سے ہر ستون کے بالائی حصے کو محرابی خم دے کر اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ ہر طرف

محراب ہی محراب بن گئے ہیں اور اوپر چھت قائم ہوگئی ہے، محرابوں کے کٹاؤ اور جوڑ میں اس قدر صفائی اور یکسانیت ہے کہ معلوم ہوتا ہے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے، جسے دیکھکر انسان دنگ رہ جاتا ہے، اس خصوصیت کی بنا پر یہ مسجد ہندوستان کی قدیم عمارتوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے، پوری عمارت میں کہیں بھی کوئی ایسا سوراخ یا شگاف نہیں جس میں کوئی پرندہ آشیانہ بنا سکے،

منبت کاری

سنگ مرمر میں بیل بوٹے کندہ کرنا اور پچیکاری کا کام آسان ہے، اور اس کے اعلیٰ نمونے بہت سی عمارتوں میں دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن فولاد کی طرح سخت پتھروں میں غبت کاری اور باریک نقش ونگار کندہ کرنا بہت مشکل ہے، یہ نادر صناعی اس جامع مسجد ہی میں نظر آتی ہے، مغربی دیواروں کی کمانوں میں جو قد آدم محرابیں ہیں ان کے حاشیے پر بہت عمدہ بیل بوٹے تراشے گئے ہیں، جن کی نوک پلک اور صفائی کو دیکھکر انسان کچھ دیر کے لیے عالم حیرت میں گم ہوجاتا ہے، خصوصاً وسطی محراب کی آرایش دیکھنے کے لائق ہے، اس کے علاوہ سامنے کے رخ کی کمانوں کے اوپر ہر ستون کے بالائی حصے میں نہایت خوبصورت سورج مکھی کے پھول بنائے گئے ہیں، جو عمدگی اور نفاست سے تراشے گئے ہیں کہ زمانۂ حال کا کوئی کاریگر اس صفائی سے شاید ہی بنا سکے، بلامبالغہ یہ خارا تراشی کا وہ نمونہ ہے جو دیکھنے والوں سے خراج تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا،

کتبے

مسجد کے اندر فاروقی عہد کے تین کتبے ہیں، پہلا کتبہ عربی میں بخط کوفی نہایت خوشخط تحریر ہے، یہ منبر کے بیچ والی محراب کے اوپر ہے، اس میں قرآن کی آیت اور اس مفہوم کی حدیث ہے کہ خدا بانی مسجد کو بہشت میں قصر عالی عطا فرمائے گا، اس کے بعد مسجد کے تعمیر کا ذکر ہے، اور بانی مسجد کا لقب عادل شاہ بن مبارک شاہ تحریر ہے، اس کے بعد جامع مسجد کی تعریف و توصیف لکھی ہے، آخر میں تعمیر کی ابتدا ۹۹۷ھ درج ہے اور کتبہ نویس کا نام مصطفےٰ ابن نور محمد خطاط کندہ ہے،

دوسرا کتبہ مسجد کے شمالی کونے کی محراب پر ہے، یہ بھی عربی میں بخط طغرا تحریر ہے، اس میں قرآن مجید کی آیت اور حدیث نبوی ہے، اس کے بعد سلاطین فاروقیہ کا شجرۂ نسب اور آخر میں مسجد کی ابتدائے تعمیر کا سنہ درج ہے،

تیسرا کتبہ اسی محراب میں عربی تحریر کے نیچے ہے، جو سنسکرت میں ہے، اس میں کلام اللہ کی آیت اور حدیث کا ترجمہ ہے، اس کے بعد شاہان فاروقیہ کا شجرۂ نسب اور آخر میں جامع مسجد کے سنگ بنیاد رکھنے کا وقت، دن، مہینہ، سمبت بکرمی اور شکے راس گھڑی اور پل نہایت تفصیل سے تحریر ہے،

اس کتبے سے مسلمان بادشاہوں کی مذہبی رواداری کا ثبوت ملتا ہے، جنھوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں اپنی ہمسایہ قوم کی سنسکرت زبان کو عبادت گاہوں میں جگہ دی،

اس کتبے میں سمبت بکرمی ۱۶۴۶ھ مطابق شکے ۱۵۱۱ھ تحریر ہے، اسیر گڑھ کی جامع مسجد میں بھی اسی طرح سنسکرت زبان اور رسم الخط میں کتبہ موجود ہے،

اس کے مقابلے میں آج اس جمہوری دور میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقلیت کی زبان اور کلچر کے ساتھ تعصب رکھتے ہیں، ان کے لیے جامع مسجد کا سنسکرت کتبہ اس کا بین ثبوت ہے کہ مسلم فرمانرواؤں نے اپنی غیر مسلم رعایا کی زبان اور کلچر کا کتنا لحاظ رکھا ہے،

چوتھا کتبہ مسجد کے جنوبی مینار پر ہے، جو قلعہ آسیر کی فتح کے بعد اکبر بادشاہ کے حکم سے کندہ کیا گیا ہے، یہ فارسی زبان میں بخط نستعلیق ہے، اس میں اسیر کی فتح اور بہادر شاہ فاروقی کی اطاعت کا حال تحریر ہے، آخر میں کتبہ نویس کا نام محمد معصوم معہ ولدیت اور وطنیت درج ہے، اس کے بعد اکبر کی لاہور روانگی کا حال ہے،

کتبے کی عبارت حسب ذیل ہے:-

تاریخ الٰہی عبارت ست از زمان جلوس حضرت شاہنشاہ ظل الٰہ اکبر بادشاہ غازی کہ
زتائید جوان بخت خویش قلعہ آسیر کشاد ہ

گشت آباد اسیر از زاں نامی
سنہ بشش بگفت الٰہ آباد!

تاریخ ۱۱ فروردین ماہ الٰہی ۴۵ موافق ۵ رمضان ۱۰۰۹ ہجری
حضرت شاہنشاہ فلک بارگاہ ظل الٰہ برہانپور امقر رایات ظفر آیات ساختند و بہادر
خاں آمدہ پابوس مشرف شد و ادرا با اتباع جان بخشی کردند و قلعۂ آسیر فتح شد ہ

شاہ غازی جلال دیں اکبر — آں بتائید بخت قلعہ کشا
کرد فتح اسیر از اں نامی! — گفت بگرفت قلعہ اعلا

قائلہ و کاتبہ محمد معصوم المتخلص بہ نامی بن سید صفائی الترمذی اصلاً و البکری مسکناً و مدفناً
و المنتسب انا الی سید شیر قلندر ابن بابا حسین ابدال السبزواری مولداً و القندھاری
موطناً دم قد اتاریخ روز دوازدہم ماہ اردی بہشت سنہ ۴۶ موافق ۲۶ شوال ۱۰۰۹ھ

بندگان حضرت عازم لاہور شدند ہ

نسخ خاندیش و دکن چوں کرد شاہ — عازم ہندوستاں فی الفور شد
یک عدد نامی فزود آں گاہ گفت — شاہ والا عازم لاہور شد!

مینار مسجد کے شمالی اور جنوبی کنارے دو فلک بوس ۹ مینار سر اٹھائے کھڑے ہیں، جو زبان حال سے بانی مسجد کی شان و شوکت کا اعلان کرتے ہیں، اور میلوں دور سے دکھائی دیتے ہیں، ان کی بلندی صحن سے گنبد کی چوٹی تک ۱۲۵ فیٹ ہے، ہر مینار کے چار حصے ہیں۔

پہلا حصہ صحن کی چھت تک چوکور ہے جس کا ہر ضلع ½ ۱۰ فیٹ ہے، دوسرا اور تیسرا حصہ ہشت پہلو ہے، ان کا ہر ضلع ½ ۴ فیٹ ہے، چوتھا حصہ ۱۶ پہل کا بنا ہوا ہے، یہ دونوں حصوں سے کچھ چھوٹا ہے، چھت سے اوپر میناروں کا بیرونی دور ۳۶ فیٹ ہے، ہر مینار کے اوپر چار چار در کے خوش قطع برجیاں ہیں، ان کے اوپر اینٹ چونے کے خوبصورت گنبد اور گنبدوں پر طلائی کلس ہیں، ان کی اونچائی ۵ فیٹ ہے، کلس کی شکل یہ ہے کہ چار گولے تلے اوپر رکھے ہیں، اور ان کے اوپر سنہری پان نصب کیے گئے ہیں، کلس کا دور اتنا ہے کہ دونوں ہاتھوں میں نہیں سما سکتے، مگر زمین سے چھوٹے چھوٹے پیالوں کی طرح نظر آتے ہیں،

دونوں میناروں کا توازن اور تناسب یکساں ہے، ان کی بلندی کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں جب کہ باربرداری کے آلات اور کرین وغیرہ نہ تھے، اس قدر وزنی پتھر کس طرح اوپر چڑھائے گئے ہوں گے، دونوں میناروں میں اوپر جانے کے لیے چکردار زینہ ہے، شمالی مینار کا زینہ کسی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے، جنوبی مینار سے اوپر جا سکتے ہیں، مینار میں کئی جگہ روشندان ہیں، جن سے اوپر جانے والے کو ہوا اور روشنی ملتی ہے، مینار کے اوپر سے سارا شہر دکھائی دیتا ہے، سرسبز درختوں کے درمیان مکانوں کی سفید چھتیں عجب خوشنما منظر پیش کرتی ہیں، کئی میل دور تک کا نظارہ یہاں سے ہوتا ہے، ۱۹۲۴ء میں جنوبی مینار کے چھجے کا ایک پتھر ٹوٹ گیا تھا، اس وقت کے محکمۂ آثار قدیمہ کے ایک انگریز افسر سر جان مارشل صاحب نے اپنی جیب خاص سے اس کی مرمت کرا دی تھی،

اس کے بعد شمالی مینار کے چھجے کا ایک بڑا پتھر زلزلے کے صدمے سے گر پڑا، وزنی ہونے کے سبب اوپر نہیں چڑھایا جا سکتا تھا، اس لیے کاریگروں نے وہ حصہ سمنٹ سے ڈھال کر درست کر دیا،

صحن مسجد سے ملا ہوا کشادہ صحن ہے جس کا طول شمالاً جنوباً ۲۰۰ فیٹ ہے، اس کے شمال و جنوب

میں پختہ دیواروں کا احاطہ ہے، یہ صحن بھی مسجد کے ساتھ ہی تعمیر ہوا تھا، اس لیے دو مرتبہ اسکی مرمت ہو چکی ہے، پہلی بار تیموریوں کے عہد میں خان خاناں عبد الرحیم نے، جب وہ یہاں کے صوبہ دار تھے، چونے اور گچ سے تعمیر کرایا تھا، مصنف مآثر رحیمی لکھتا ہے:۔

"صفۂ وسیع و منیع کہ با عرصۂ سماوات دم مساوات می زند در پیش طاق آں ساختہ بودند۔ بمرور ایام بسان بنائے عمر ظلمہ منہدم و ویران شدہ بود۔ بساختن و تعمیر امر فرمودند و بنوعے باتمام رسید کہ زبان قلم مکسور اللسان از تعریف و توصیف آں عاجز ست۔" (ص ۶۰۳ ج ۲)

اس کے بعد جب دوبارہ خراب ہوا اور کئی جگہ سے پلاسٹر اکھڑ گیا تو ایک کچھی میمن حاجی کریم لوز محمد صاحب کے فرم نے اپنے خرچ سے از سر نو تعمیر کرایا،

اس مرتبہ یہ پالش کیے ہوئے سفید شاہ آبادی پتھروں سے جوڑا گیا، صحن کے درمیانی حصے میں سفید پتھروں کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے کالے پتھروں کے چوکور ٹکڑے جوڑ دیے گئے، جس سے صحن کی خوشنمائی میں اضافہ ہو گیا ہے، اس تعمیر میں دس ہزار روپے صرف ہوئے، یہ تعمیر ۱۳۵۲ھ میں ہوئی تھی، شہر کے ایک مشہور شاعر حضرت خیالی مرحوم نے حسب ذیل تاریخ تعمیر لکھی تھی:۔

تعمیر فرش باوجب ۱۳۵۲ھ

پہنچتا ہے جب آکے وقت سعید — تو نیکی سے ہوتا ہے دل آشنا

عطا ہوتی ہے عمر میں خاص بات — ہمیشہ یونہی دور دوراں رہا!

ہوا سرخرو وہ خدا کے قریب — جو مسجد کا اک کام پورا کیا

خیالی ادا ہو گیا خیر سے — یہ حصہ تھا احکام اللہ کا

چمک لے کے سجدوں کی مصرع کہو

سپہر بریں فرش سنگیں بنا

ھ ۱۳ ۵۲

اس کے بعد ۱۳۷۱ھ میں صحن کا پچھلا حصہ ایک دوسرے میمن سیٹھ محمد ہاشم صاحب نے بنوایا، یہ معمولی شاہ آبادی پتھروں سے جوڑا گیا ہے، صحن اتنا وسیع ہے کہ ایک ہی وقت میں اس میں پانچ ہزار آدمی باجماعت نماز ادا کر سکتے ہیں،

حوض: فاروقی بادشاہوں کے عہد میں شہر میں آب رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا، لوگ عام طور سے کنوؤں کا پانی استعمال کرتے تھے، عبد الرحیم خان خاناں نے اپنی صوبہ داری کے زمانے میں اس کمی کو محسوس کر کے شہر سے چار میل دور پہاڑیوں میں میٹھے پانی کے قدرتی چشمے دریافت کیے اور وہاں سے زمین دوز نہروں کے ذریعہ جامع مسجد تک پانی لایا گیا اور یہاں سے مٹی کے نلوں سے شہر کے مختلف حصوں سے پہنچایا گیا، مآثر رحیمی میں اس نہر کی تعمیر کا حال اس طرح لکھا ہے:۔

"از لعل باغ تا در مسجد جامع کہ در جنب میدان برہانپور واقع ست کہ وسط حقیقی این شہر ست بنّایان چابک دست و معماران صاحب فطرت را گماشتند کہ بسنگ و گچ و آہک ممر و مجری آں را بصد استحکام جوئے شیر و نہر الخیر ترتیب دادند، حقا کہ اگر فرہاد زندہ بودے اعتراف کردے کہ ناسخ جوئے شیر ست۔ و در مسجد حوضے خارا بنیان و بنائے عالی مکان بنا نہادند۔" (ص ۶۰۲ ج ۲)

مولانا فرید الدین منجم دہلوی نے اس نہر کی تکمیل کی تاریخ لکھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۰۲۴ھ میں بنکر تیار ہوئی تھی،

سپہ سالار گیتی خان خاناں — ستون بارگاہ شہریاری

کف رادش پل رود سوال ست — نم دستش ز جود ابر بہاری
روان کردہ بشہر اندر قناتے — کہ زو سیراب شد سوتی و داری
در ایام جہانگیر جہاں بخش — کہ از فرتش بنا زد تا جداری
گرفت انجام کار چشمہ خیر — مبادا انجام جریانش زباری
بود چوں دولتِ نامیش لازوال — بود تا دور ہائے روزگاری

دل دانا چو تاریخش بہ پرسید !

جوابش داد ہاتف۔ خیر جاری
۱۰۲۴ھ

مسجد میں ایک حوض فاروقیہ زمانے کا موجود تھا، خان خاناں نے اسی نمونے کا دوسرا حوض بنوایا، یہ دونوں حوض صحن کے شمالی اور جنوبی سرے پر ہیں، ان کا طول وعرض ۳۰×۳۰ فیٹ مربع ہے، پہلے یہ ہر وقت پانی سے بھرے رہتے تھے، جنوبی حوض کے پاس ہی پانی کا خزانہ تھا، جہاں سے قدیم نلوں کے ذریعے حوض میں پانی آتا تھا، جو صحن کی تعمیر کے وقت توڑ دیا گیا،

۱۹۲۳ء میں میونسپل کمیٹی نے اسی حوض میں ایک نل لگوا دیا تھا لیکن سطح ٹھیک نہ ہونے سے پانی کم آنے لگا، اور اس کی پہلی افراط خواب وخیال ہوگئی، آج مسجد میں پانی کی قلت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے، جس جامع مسجد کی بدولت آج بھی تمام شہر کو پانی مل رہا ہے، اسی جگہ پانی کی کمی ہے، کاش میونسپل کمیٹی اپنی ذمہ داری محسوس کرتی، صحن کی تعمیر کے وقت سیٹھ محمد ہاشم صاحب نے حوضوں کے وضو گاہ پر سائبان لگوادیا، تاکہ بارش اور موسم گرما میں نمازیوں کو وضو کرنے میں تکلیف نہ ہو۔

مزارات | دونوں حوضوں کے درمیان صحن سے ملا ہوا ایک مستطیل چبوترہ ہے جس پر موجودہ

پیش امام سید احکام اللہ صاحب کے والدین اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے مزارات ہیں، اس چبوترے اور حوض کے گرد آہنی سلاخوں کا قد آدم کٹہرا ہے اور اندر جانے کے لیے تین جگہ لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے ہیں،

حجرے | مسجد کے احاطے میں تینوں طرف ۲۲ حجرے ہیں جو اینٹ اور چونے سے تعمیر کیے گئے ہیں، ہر ایک کا طول وعرض ۱۵×۱۵ فیٹ مربع اور اونچائی تقریباً ۱۲ فیٹ ہے، یہ مغلیہ عہد حکومت میں بنائے گئے تھے، کیونکہ عادل شاہ کو تعمیر مسجد کے بعد کچھ ایسی مہمات پیش آئیں کہ وہ عمارت کے شایان شان حجرے اور صدر دروازہ تعمیر نہ کرواسکا،

بادشاہ مذکور کی وفات کے بعد جب یہاں مغلوں کی عملداری ہوئی، اور عبد الرحیم خانخاناں صوبہ داری پر مامور ہوا، اس وقت اس نے اپنے پیر ومرشد میر محمد نعمان اکبر آبادی کی نگرانی میں حوض، حجرے اور دروازہ وغیرہ بنوایا، میر صاحب اپنے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی تبلیغ واشاعت کے لیے برہانپور میں مقیم تھے، مدت تک جامع مسجد کی امامت کرتے رہے،

عرصہ دراز سے بے مرمت پڑے رہنے کی وجہ سے ان حجروں میں سیل ہوگئی ہے اور بعض کی چھتیں ٹپکنے لگی ہیں، شمالی جانب کا ایک حجرہ توڑ کر راستہ نکالا گیا ہے، چند حجروں کو دوکانداروں نے کرائے پر لے رکھا ہے، باقی خالی پڑے ہیں، اگر ان کی نئے سرے سے مرمت ہوجاتی تو مسجد کے اخراجات بآسانی پورے ہوسکتے تھے، فی الحال ۲۵۔۳۰ روپیہ ماہانہ وصول ہوتا ہے، جس سے روشنی اور صفائی کا خرچ اور موذن کی تنخواہ بمشکل دی جاتی ہے، چند سال سے میونسپل کمیٹی نے ان حجروں پر ہاؤس ٹیکس لگا کر مزید بار ڈال دیا ہے، افسوس ہے کہ اتنی بڑی عمارت کے لیے اخراجات کا کوئی معقول انتظام نہیں، اور نہ موجودہ پیش امام مولانا سید احکام اللہ صاحب کو کوئی تنخواہ ملتی ہے، آپ کے پردادا حافظ سید کرم اللہ صاحب بخاری

کے زمانے سے مسجد کی نگرانی آپ ہی کے خاندان میں چلی آتی ہے، موصوف ۱۹۱۱ء سے جامع مسجد کی امامت اور خدمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں،

صدر دروازہ احاطے کی مشرقی دیوار کے بیچ میں صدر دروازہ ہے، یہ بھی حجروں کے ساتھ ہی بنایا گیا تھا، اس کی دہلیز کا طول ۳۴ فیٹ اور عرض ۱۲ فیٹ ہے، اس میں ابھی تک جہانگیری زمانے کے لکڑی کے کواڑ لگے ہیں، یہ دروازہ عمارت کی بلندی اور شان کو دیکھتے ہوئے بہت چھوٹا یعنی صرف ۱۲ فیٹ اونچا تھا، ۱۲۸۲ھ میں جب بھوپال کی بیگم نواب سکندر جہاں بیگم مع اپنی والدہ کے بھوپال سے بمبئی حج کے لیے جانے لگیں تو چند دن برہان پور میں قیام کیا تھا، انھوں نے دوسرا عالیشان دروازہ بنانے کا حکم دیا، اور اس کے لیے دو ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے عطا فرمائے، اور سرکاری اہلکاروں کی نگرانی میں ۱۲×۸ فیٹ زمین قدیم دروازے سے آگے بڑھا کر یہ شاندار محرابی پھاٹک تعمیر ہوا جس کی بلندی تقریباً ۲۵ فٹ ہے، یہ پتھر سے جوڑا گیا ہے، اور اس کی چھت منقش ہے، تاریخ حسب ذیل مصرعہ سے برآمد ہوتی ہے:

مثل درِ فردوس معلی آباد

۲ ۸ ۱۲ ۵

اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا دروازہ جنوبی رخ پر بھی ہے، جس کا راستہ بازار کی طرف نکلتا ہے، آج یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ اتنی بڑی عمارت کے مصارف کا کوئی بھی بندوبست نہیں، ممکن ہے شاہانِ وقت نے کچھ اوقاف مسجد کے لیے کیے ہوں لیکن آج ان کا پتہ نہیں چلتا، البتہ زمین کے پیچھے کی زمین کے کچھ کاغذات تھے، جس کے حاصل کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی، مگر مقامی مسلمانوں کے آپس کے اختلافات نے کامیابی نہ ہونے دی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ زمین نزول میں نکل گئی، مسجد کے جنوبی حصے کی زمین کو میونسپل کمیٹی نے خرید کر مولانا آزاد کے نام پر ایک پارک بنا دیا، پھر چند سال بعد کسی مصلحت کی بنا پر اس پارک کو ختم کرکے

اس کی جگہ پختہ دکانیں تعمیر کر دی گئیں،

نزول والوں نے بھی مسجد کی عقبی اور شمالی دیوار سے ملا کر کئی دکانیں بنا کر کرایہ پر دیدی ہیں، اس طرح انگریزوں کے زمانے سے مسجد کے اطراف میں جو محفوظ جگہ چھوڑ دی گئی تھی، اب تینوں طرف سے دوکانوں نے اس کا محاصرہ کر لیا ہے، جامع مسجد کے جنوبی سرے پر چند حلوائیوں کی دوکانیں ہیں، جو بالکل دیوار سے ملی ہوئی ہیں، ان کے دھوئیں سے عمارت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک مسجد کمیٹی بنائی گئی تھی، پھر معلوم نہیں کیوں اس کا خاتمہ ہوگیا، فی الحال جامع مسجد کے میناروں کا بالائی حصہ مرمت طلب ہوگیا ہے، اور بعض جگہ پتھروں کے جوڑ اکھڑنے لگے ہیں جس کی مرمت کے لیے کافی رقم درکار ہے،

ہم محکمۂ آثار قدیمہ سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ دیگر تاریخی عمارتوں کی طرح جامع مسجد برہان پور کو بھی اپنی نگرانی میں لے لے تاکہ فن تعمیر کا یہ نادر نمونہ جو اپنے آرٹ اور سنگ تراشی کے لحاظ سے بے مثل ہے، محفوظ رہ سکے۔

علم بدیع کا موجد

(ابن المعتز)

از جناب احتشام احمد صاحب ندوی ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علم بدیع عربی تنقید کا ایک اہم موضوع ہے، بدیع کے معنی کوئی نئی اور انوکھی چیز پیدا کرنے کے ہیں، اس لفظ کو "اصطلاح" کی حیثیت ابو تمام کی شاعری سے حاصل ہوئی، ابو تمام نے قدیم شعراء کے مضامین اور ان کے حدود معینہ سے آگے بڑھ کر اپنی شاعری میں نئے مضامین باندھے اور اپنے خداداد ذہن و فکر سے نئی نئی ترکیبیں استعمال کیں، یہ نئے مضامین اور نئی ترکیبیں ابو تمام کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی موضوع اختلاف رہیں، اس جدت کا نام عربی تنقید میں مذہب بدیع یا بدیع مکتب فکر رکھا گیا،[1]

چونکہ اس طرز شاعری نے قدیم عربی اسلوب شاعری سے اختلاف کیا تھا، اس کے علاوہ اس میں کہیں کہیں تکلف سے فلسفیانہ اور پیچیدہ اسلوب بیان، تعقید لفظی و معنوی اور مشکل مضامین بھی ہوتے تھے، اس لیے بعض ناقدوں نے اس طرز پر کڑی تنقیدیں کیں، بعض نے یہ ثابت کیا کہ ابو تمام کے یہاں جو جدید باتیں ملتی ہیں وہ در اصل جدید نہیں ہیں، بلکہ قدماء کے یہاں بھی موجود تھیں، چنانچہ ابن المعتز نے اپنی کتاب "کتاب البدیع" میں ثابت کیا ہے کہ علم بدیع تو قرآن مجید، احادیث نبوی اور قدیم کلام عرب میں بھی موجود ہے، تیسری اور چوتھی صدی کے اکثر ناقدوں نے ابو تمام پر "سرقہ"

[1] النقد المنہجی عند العرب تالیف ڈاکٹر محمد مندور مطبوعہ نہضۃ مصر ص ۴۲ - ۴۳،

کا الزام لگایا، یہی وجہ ہے کہ سرقہ کا تفصیلی ذکر ہر عربی تنقید کی کتاب میں ملتا ہے، اور اس کو عربوں نے مستقل فنی و تنقیدی مسئلہ بنا کر پیش کیا ہے،[1]

اسی طرح کے اختلافات متنبی کی شاعری سے بھی پیدا ہوئے، کیونکہ اس نے بھی قدیم عرب شعرا سے ہٹ کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا تھا، جس میں یونانی فلسفہ کا اثر بھی موجود تھا،

ابو تمام کے بعد بھی اس کے اور اس کے معاصر البحتری کے بارہ میں عرب ناقدین باہم مختلف الرائے رہے، اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ علم بدیع اور اس کی بحثیں تیسری صدی میں موجود تھیں، مگر اس موضوع پر کسی نے نہ کوئی کتاب لکھی تھی اور نہ اس کا پورا مطالعہ ہی کیا تھا، ابن معتز پہلا شخص ہے جس نے علم بدیع کا سائنٹفک مطالعہ کیا، اور اس کو نہ صرف مدون کیا، بلکہ اس کی بنیادوں کو علمی نظریات سے مستحکم کر دیا، اس طرح علم بدیع کی تدوین اور علمی بنیادوں پر اس کی تاسیس کی فضیلت اس کے حصہ میں آئی،

علم بدیع کی اقسام اور تعریفات انھوں نے کہاں سے حاصل کیں؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ ابو تمام کی شاعری سے متعلق اختلافات سے اس کو اس سلسلہ میں کافی مدد ملی ہوگی، مگر مسائل کو پوری شرح و بسط سے پیش کرنا، اصطلاحات کی ایجاد اور تعریفات کا تعین کچھ آسان کام نہیں ہے، قدامہ بن جعفر کی کتاب "نقد الشعر" "کتاب البدیع" سے ہر حیثیت سے بہتر اور مکمل ہے،[2] یونانی اثرات صاف ظاہر ہیں، مگر ابن معتز، ارسطو اور جالینوس وغیرہ کا ذکر نہیں کرتا، ڈاکٹر طہ حسین نے شبہہ ظاہر کیا ہے کہ اسی زمانہ میں حنین بن اسحٰق نے کتاب الخطابۃ (Rhetoric) کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، ممکن ہے کہ ابن معتز نے اسی سے استفادہ کیا ہو،[3] اور ڈاکٹر مندور یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ابن معتز ان تمام اقسام بدیع میں سے کسی کا موجد نہیں ہے، ان میں سے چار قسمیں

[1] الزیارات الادبیہ تالیف بدوی طبانہ مطبوعہ نہضۃ مصر [2] ملاحظہ ہو نقد الشعر تالیف قدامہ مطبوعہ دار الکتب المصریہ

اس نے ارسطو سے لی ہیں، اور ایک جاحظ سے[1]۔

کتاب البدیع کے اصل عناصر پانچ ہیں، یعنی طباق، جناس، استعارہ، رد الاعجاز علی ما تقدمہا اور "المذہب الکلامی"۔ ان کے علاوہ تیرہ[13] محاسن شعری بھی ابن المعتز نے بیان کیے ہیں، المذہب الکلامی کے بارے میں ابن معتز کا یہ اعتراف کہ یہ قسم اس نے جاحظ سے لی ہے[2]،

ابن معتز کا خیال تھا کہ علم بدیع قدیم عربوں کا سرمایہ ہے، جس کو انھوں نے اپنی عقل و فہم سے حاصل کیا تھا، اور ابو تمام نے اس پر خاص توجہ کی تھی، اس کی نظر میں اس جدید مکتب فکر کی تین بنیادیں تھیں، (۱) استعارہ شعر کی بنیاد ہے (۲) طرز ادا کا اثر شعر کی ظاہری شکل پر زیادہ اور اس کے جوہر پر برائے نام پڑتا ہے، اسی سلسلہ میں وہ طباق، جناس اور رد اعجاز وغیرہ کو پیش کرتا ہے (۳) عقل کا استعمال شعر میں ضروری ہے، المذہب الکلامی کا مقصد یہی ہے[3]۔

ابن معتز کی اہمیت کا راز اسی میں ہے، اس نے مذہب بدیع کی امتیازی خصوصیات تلاش کیں اور ان کو مرتب شکل میں ایک طرز فکر کے طور پر پیش کیا

اس نے استعارہ، طباق، جناس اور رد اعجاز کی تعریف وہی کی ہے[4] جو ارسطو نے کی ہے، قدامہ نے انھیں اصطلاحات کا ترجمہ بالکل دوسرے الفاظ میں کیا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو دونوں کے پیش نظر تھا،

کتاب البدیع میں ابن معتز نے نہ صرف مثالیں عربی شاعری سے پیش کی ہیں، بلکہ اشعار پر تنقید بھی کی ہے، اور اس کی کئی مثالیں موجود ہیں[5]، ابن معتز کے تمام مباحث پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔

علم بدیع کوئی محدود شے نہیں، جس میں اضافہ ممکن نہ ہو[6]، چنانچہ ابن معتز کے بعد قدامہ، ابو ہلال عسکری

[1] النقد المنہجی عند العرب ص ۵۰ [2] کتاب البدیع ص ۵۳ [3] النقد المنہجی عند العرب ص ۴۸ [4] ایضاً ص ۵۶ [5] کتاب البدیع مطبوعہ ماسکو ص ۵۳-۴۶، ۴۷ [6] ایضاً ص ۵۸

اور آخر میں اسامہ بن منقذ وغیرہ نے علم بدیع میں بہت سی اقسام کا اضافہ کیا،

کتاب البدیع میں ابن معتز نے محاسن شعری کو بھی شامل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ علم بدیع نقد شعر سے قریبی تعلق رکھتا ہے، جاحظ ایک جگہ لکھتا ہے کہ لفظ بدیع بلاغت کی ہر قسم کو شامل ہے[1]،

نثر اور نظم میں علم بدیع کے اقسام کے استعمال کے بغیر بھی حسن ممکن ہے[2]،

واقعہ یہ ہے کہ بعد میں عربوں نے یہ اصول فراموش کر دیا ورنہ بعد کے دور میں علم بدیع کے استعمال میں اتنا غلو نہ ہوتا کہ زبان میں جمود کی نوبت آتی،

شاعری میں معنی کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اگر کسی شعر میں علم بدیع کے تمام محاسن پائے جاتے ہوں لیکن معنی کا عنصر کمزور ہو تو وہ اچھا شعر نہیں کہلا سکتا[3]،

علم بدیع کا استعمال اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی، اس کے لیے عقل اور ذوق کی رہنمائی ضروری ہے[4]،

نثر و نظم کے محاسن کا احاطہ ممکن نہیں ہے، اس میں اضافہ کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی[5]،

بدیع اور اس کے اقسام جس طرح محدثین کے یہاں پائے جاتے ہیں، اتنے قدما کے یہاں بھی ہیں[6]

ابن معتز اور قدامہ بن جعفر

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ابن معتز اور قدامہ بن جعفر دونوں نے روشنی تو ارسطو سے لی ہے، مگر دونوں کا انداز فکر بالکل مختلف ہے، دونوں نے ارسطو سے جو اصطلاحات اخذ کی ہیں ان کے مختلف نام رکھے ہیں، ایک اصطلاح کو ابن معتز "التجنیس" کہتا ہے، تو قدامہ اسی کو "التکافو" سے تعبیر کرتا ہے، ذیل کے نقشہ سے یہ فرق آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے،

ابن معتز کی وضع کردہ اصطلاحات	قدامہ کی وضع کردہ اصطلاحات
الافراط فی الصفۃ	الغلو
اعتراض کلام فی کلام لم یتم معناہ	التتمیم

[1] البیان والتبیین ج ۳ ص ۲۱۲ [2] کتاب البدیع ص ۱ [3] ایضاً ص ۵۳ [4] ایضاً ابواب العیب من الکلام والشعر [5] ایضاً ص ۱ [6] ایضاً مقدمہ مولف،

الطباق	المطابق والمجانس
التجنیس	التکافؤ[6]

ابن معتز اور قدامہ دونوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے عربی تنقید میں بدیع اور اس کے اقسام پر غور کیا، اور اپنی کتابوں میں ان کو استعمال کرکے عربی ادب میں ان کو نمایاں کیا، محاسن شعری کو بھی ان دونوں نے خاص اہمیت دی اور اس کو تلاش کرنے کی کوشش کی، لیکن ابن معتز کی کوشش محدود اور جزئی ہے، اور قدامہ بن جعفر کی پورے نقد الشعر کو محیط ہے۔

عربوں کا شغف ابن معتز سے

ابن معتز سے عربوں کو ایک خاص تعلق اس لیے ہے کہ اس نے علم بدیع کا مرجع عربوں ہی کے ادب کو قرار دیا، اس کے برعکس قدامہ کے یہاں یہ تحدید نہیں ہے بلکہ وہ کہیں کہیں ارسطو و جالینوس وغیرہ کے حوالہ بھی نقد الشعر میں دے دیتا ہے، اسی لیے عربوں کو جہاں ابن معتز کی اصطلاح مل جاتی ہے، وہاں قدامہ کی اصطلاح کو چھوڑ دیتے ہیں[1]۔

ڈاکٹر مندور کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ ابن معتز کی اصطلاحات سے عربی تنقید کی بنیاد پڑی، اور اس کی وضع کردہ اصطلاحات نے آئندہ اصول کی شکل اختیار کرلی، یہ محض ایک حسن ظن اور مفروضہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ معدودے چند اصطلاحات پر فن تنقید کی بنیاد نہیں پڑتی اور حقیقت قدامہ بن جعفر کی کتاب نقد الشعر عربی تنقید کی اصل بنیاد ہے، اس میں نقد شعر کے ہر ہر پہلو پر بحثیں موجود ہیں، جو مجبوراً عربوں کو قبول کرنا پڑیں، کیونکہ ان کے پاس اس کتاب سے بہتر کوئی تنقیدی سرمایہ نہ تھا۔

ڈاکٹر مندور کا یہ نظریہ بھی محض تعصب پر مبنی ہے کہ جہاں ابن معتز کے نظریات کا قدامہ سے ٹکراؤ ہوا وہاں ابو ہلال عسکری نے ابن معتز کے نظریات کو ترجیح دی[2]،

واقعہ یہ ہے کہ عربوں کو شروع ہی سے اپنے ادب اور اپنی شاعری پر فخر تھا، اور وہ

[1] النقد المنہجی عند العرب ص ۶۶ - ۶۷ [2] ایضاً ص ۳۱۴

اس سلسلے میں کسی دوسرے کا احسان ماننے کے لیے تیار نہ تھے، اسی لیے انھوں نے یونانی خیالات کو عربی میں بہت کم منتقل کیا، اور عربی ادب و شعر پر اسی لیے اس کے اثرات بھی کم پڑے، اور اسی بنا پر وہ قدامہ کی فضیلت کے قائل نہیں ہیں، اس کے مقابلہ میں ابن معتز، آمدی اور قاضی جرجانی وغیرہ کو زیادہ بڑا ناقد شمار کرتے ہیں[1]۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر بدوی طبانہ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ابن معتز کی وجہ ترجیح صرف یہ ہے کہ اس نے قدامہ سے پہلے اپنی کتاب تصنیف کی اور عرب عموماً متقدم کو ترجیح دیتے ہیں[2]، اگر یہ کلیہ صحیح ہوتا تو پھر وہ "قواعد الشعر" تالیف ابو العباس ثعلب کی اصطلاحات کو ترجیح دیتے جو ابن معتز کی کتاب سے بھی پہلے کی تصنیف ہے، اور ابن خلدون، ابن رشیق قیروانی کی کتاب "العمدہ" کو جو پانچویں صدی کی تصنیف ہے، سب سے بہتر قرار نہ دیتے[3]، کیونکہ اس سے پہلے متعدد تنقیدی کتابیں موجود تھیں،

علم بدیع کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس سے عربی ادب کو نقصان پہنچا اور وہ اس میں جمود کا باعث بنا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بدیع کی ایجاد ان ذہنی ترقیوں کا نتیجہ تھی جو عصر عباسی میں عربوں نے کیں، ادب و تنقید میں علم بدیع عربوں کی فکر کا بہترین مظہر ہے، بدیع عربی تنقید کے ان بنیادی عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے، جس کو تمام ناقدین عرب نے اپنی کتابوں میں موضوع بحث بنایا ہے، اکثر ناقدوں نے بدیع کی اقسام ہی کے ذریعہ شعراء کے محاسن کلام کو نمایاں کیا ہے، چنانچہ آمدی نے اپنی کتاب "الموازنۃ بین ابی تمام والبحتری" اور قاضی جرجانی نے اپنی کتاب "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" میں علم بدیع ہی کو معیار بناکر شعراء کے کلام کو جانچا ہے، اور ان کی شاعرانہ عظمت نمایاں کی ہے،

[1] النقد المنہجی عند العرب ص ۸۰ [2] قدامہ بن جعفر والنقد الادبی تالیف بدوی طبانہ ص ۹۴ [3] ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر باب علوم اللسان العربی ص ۵۵

علم بدیع فی نفسہ مفید ہے، البتہ اس کا غلط اور بکثرت استعمال یقیناً برُے نتائج پیدا کرتا ہے، علمِ بدیع تو اصل میں حسنِ کلام کو جانچنے اور پرکھنے کا ایک ذریعہ تھا، لیکن پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے طویل عرصہ میں ادبا و شعراء عمداً بدیع کی اقسام کو شعر میں سمونے کی کوشش کرتے رہے جس سے ادبِ عربی کو سخت نقصان پہنچا اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی زبان وجود میں آئی جس میں الفاظ زیادہ اور معانی کم یا مفقود ہوتے تھے،

اہل نظر ادیب اور نقاد جب ادب و شاعری کے محاسن کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں تو اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ ان محاسن کو بہ تکلف کلام میں پیش کیا جائے، ابن معتز، قدامہ ابن جعفر اور ابوہلال عسکری وغیرہ نے علم بدیع پر جو فکر انگیز بحثیں کیں اور انھیں شعر و ادب کا بہترین مظہر قرار دیا، اس سے یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ ان محاسن کا تتبع ضروری ہے، اور ان کے بغیر شاعری شاعری نہیں ہے، حالانکہ خود ابن معتز نے لکھا ہے کہ علمِ بدیع کے بغیر بھی کلام میں حسن ممکن ہے، علمِ بدیع کا استعمال اگر فطری طور پر ہو تو وہ حسن ہے، لیکن اگر بہ تکلف اسکو ٹھونسا جائے تو عیب بن جائے گا، اور کلام میں خوبی باقی نہ رہے گی، اس لیے اول درجہ کے اصحاب فن کبھی ان چیزوں کی تقلید نہیں کرتے، ورنہ ان کے کلام سے جدت و ندرت مفقود ہو جائے، علم بدیع اور اس قبیل کے دوسرے علوم مثلاً بیان اور معانی وغیرہ کی پابندی درحقیقت درجہ دوم کے وہ شعراء کرتے ہیں جو فنی حیثیت سے ناقص ہوتے ہیں[1]

ابن معتز اور محاسن شعر

ابن معتز نے محاسن شعر پر جو بحث کی ہے، اس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، واقعہ یہ ہے، ان کی تیرہ اقسام میں سے تشبیہ، غلو، کنایہ اور حسن تضمین وغیرہ کو فن تنقید میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے، جیسا کہ تنقید کی ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے جو چوتھی

[1] النقد المنہجی ص ۵۳،

اور پانچویں صدی ہجری میں تصنیف کی گئیں، شعر کے محاسن بے شمار ہیں، ابن معتز نے مذکورہ بالا محاسن کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ کسی کو بھی یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ جتنے محاسن اس نے تلاش کیے ہیں اس سے زیادہ نہیں ہیں[1]، ابن معتز سے قبل بھی ابوالعباس ثعلب ابن قتیبہ اور ابن سلام وغیرہ نے تنقیدی کتابیں لکھی تھیں، مگر ان میں سے کسی نے نہ شعر کے محاسن سے بحث کی ہے اور نہ اس کو فکر کا موضوع قرار دیا ہے، اس حیثیت سے ابن معتز کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس نے عربی شاعری کی تنقید کے لیے ایک نئی راہ کھولی،

ابن معتز کے ادبی اور تنقیدی ذوق کا اندازہ ان کی مشہور کتاب "طبقات الشعراء" سے بھی ہوتا ہے، اس کے بارہ میں عبد الستار فراج نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ ابن معتز طبقات الشعراء میں محض ایک راوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسا شایق شعر و ادب بن کر سامنے آتا ہے، جو اپنے جذبات حسن و قبح کو چھپا نہیں سکتا[2]،

نظم و نثر دونوں میں یکساں بلکہ بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہے، عام طور سے ادباء کے اشعار بے جان ہوتے ہیں اور شعراء کی نثر بے روح، لیکن دونوں صلاحیتوں کا اجتماع جس شخص میں ہو جائے تو یہ اس کے عظیم فنکار ہونے کی دلیل ہے[3]،

سب سے بہتر کلام وہ ہے کہ سامع اسے سنکر یہ سمجھے کہ وہ بھی اس طرح کہہ سکتا ہے، مگر جب کہنا چاہے تو عاجز رہ جائے، یہ خیال ابن قتیبہ نے بھی الشعر والشعراء میں ظاہر کیا ہے، مگر ابن معتز نے اس کا ایک اصطلاحی نام "سہل ممتنع" بھی تجویز کر دیا ہے[4]،

ایک جگہ ابن معتز نے ایک اہم تنقیدی مسئلہ سے بحث کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ عام رجحان ہے کہ جس شعر میں شوخی و بے باکی اور بے حیائی ہو اس کو لوگ فوراً ابونواس کیجانب منسوب

[1] کتاب البدیع ص ۵۸ [2] طبقات الشعراء تالیف ابن المعتز ص ۵ [3] طبقات الشعراء ص ۳۰۸ [4] ایضاً ص ۳۷۷،

کردیتے ہیں، بالکل اسی طرح کہ جس شعر میں لیلیٰ کا ذکر ہو اس کو بلا تکلف مجنوں بن عامر کی جانب منسوب کردیتے ہیں، ابن معتز کے نزدیک یہ عوام کا طرز ہے اہل فکر کا نہیں،[1]

طبقات الشعراء سے اس کی ایک اور خصوصیت کا بھی علم ہوتا ہے، اس نے اپنے پیش رو ناقدین ابن سلام اور ابن قتیبہ کی طرح تمام شعراء کا ذکر اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے معاصرین کا انتخاب کیا ہے، اس جدت سے بڑا فائدہ ہوا کہ بعد کے اکثر مصنفین نے اس کی تقلید کی اور اپنی بحث دائرہ معاصرین تک محدود رکھا،

ابن معتز کی ایک دوسری کتاب "طبقات الشعراء" بھی ہے جس میں صرف ان شعراء کا ذکر ہے، جنھوں نے عباسی خلفاء کی مدح میں قصائد لکھے ہیں

مذکورہ بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابن معتز اپنے دور کے ممتاز ناقدین میں تھا، اس کی نظریاتی تنقید کا مظہر کتاب البدیع ہے اور علمی تنقید کا طبقات الشعراء، اس کی عظمت اس سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ تیسری صدی کا آدمی ہے، جبکہ عربوں کے علوم و فنون غیر مرتب اور غیر مدون تھے، اس زمانہ میں اس نے علم بدیع کو مدون کیا، اس لحاظ سے اس کو ادبی تنقید کے ارتقا میں غیر معمولی اہمیت اور عظمت حاصل ہے۔

---

[1] طبقات الشعراء ص ۸۹

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب عماد الملک سید حسین بلگرامی

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی ؒ

یہ خط بعد میں ملے، اس لیے سلسلہ میں نہ شائع ہوسکے تھے، ان کو اب شائع کیا جاتا ہے۔

سیف آباد حیدر آباد دکن

غرۂ اپریل سنہ ۱۹۲۴ء

جناب من

میں اپنا سالانہ چندہ سنہ ۲۳ء و سنہ ۲۴ء کا ملفوف کرتا ہوں، دفتر کو تاکید فرمائیے کہ رسید جلد بھیج دیں، اگر میں زندہ رہا تو سنہ ۲۵ء کا چندہ اوائل سال ہی یعنی ماہ جنوری یا فروری یا مارچ میں ادا کر دیا جائے گا۔

میری صحت درست نہیں ہے، اور میری بصارت میں بھی ضعف ہے، آپ کا پھر کبھی یہاں آنا ہوگا،

بندہ

سید حسین عماد الملک بلگرامی

سیف آباد، حیدر آباد دکن

۸ رجون سنہ ۱۹۲۴ء مطابق ۳ رذیقعدہ سنہ ۱۳۴۲ھ

جناب مکرمی محترمی معظمی زید معالیہ و بورکت ایامہ ولیالیہ

روداد دار المصنفین کی دیکھنے میں آئی، تعجب ہوا کہ ادنیٰ اراکین میں بھی اس ناچیز کا نام نہیں ہے[1]

---

[1] روداد میں اراکین کے نام شائع نہیں ہوتے۔

اور نہ میں نے جو دو سو[۲۰۰] روپیہ حضرت کی خدمت میں گذرانے تھے، ان کا کہیں پتہ معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔

معارف میں جناب کے مضامین جب کبھی مطالعہ میں آتے ہیں تو بڑی مسرت ہوتی ہے اور بہت کچھ علمی فائدہ پہنچتا ہے، یہاں ہم لوگوں کو امید تھی کہ جناب عنقریب یہاں تشریف لائیں گے، مگر اس وقت تک تو جناب کی تشریف آوری نہیں ہوئی، اب معلوم نہیں کب تشریف لائیں گے۔

جناب کے مضامین جو وقتاً فوقتاً معارف میں نکلتے ہیں، وہ اگر جمع کرکے کتاب کی صورت میں طبع کرالیے جائیں تو بہت مناسب ہوگا۔

ندوہ کالج کی کیا حالت ہے، اور عربی کا درس کہاں تک ہوتا ہے، اور کتنے طلبہ اس میں شریک ہوتے ہیں۔

بندہ تو اب بیکار محض ہے، صحت درست نہیں ہے، اور پاؤں کے درد کے مارے سخت تکلیف ہے۔

بندہ کے رسائل ملاحظہ سے گذرے ہوں گے، جناب کی ان کے نسبت کیا رائے ہے، جناب کے قلم سے ان کے اصلاح کی ضرورت ہے، فقط زیادہ کیا عرض کیا جائے
لطف عالی زیاد باد

بندہ

سید حسین بلگرامی عماد الملک

۲۶ مارچ ۱۹۲۵ء

جناب مخدومی مکرمی معظمی زیدت معالیہ ودبرکت ایامہ ولیالیہ

عنایت نامہ عرصہ ہوا پہنچ گیا، مگر بعض وجوہ سے جلد جواب روانہ نہ کرسکا، میری تو

آرزو تھی کہ میں اپنی سرکار میں دوبارہ سیرۃ کی جلدوں کے بابت کچھ عرض کروں، مگر اس وقت حالت یہاں کی کچھ ایسی ہے کہ مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا، اور نہ کسی ایسی ذات سے واقف ہوں کہ وہ اس بارہ میں کچھ کرسکے، بندہ تو ہمہ تن گوشہ نشین و عزلت گزیں ہے، پاؤں کی درد اور تکلیف کی وجہ سے کہیں جانا آنا بھی نہیں ہوتا، اس پر بھی جہاں تک اس عاجز سے ممکن ہوگا کوشش کرے گا،

جہاں تک میری بصارت اجازت دیتی ہے، آپ کے معارف کو ہمیشہ زیر مطالعہ رکھتا ہوں، بے مثل رسالہ ہے،

اس عریضہ کے اختصار کو معاف فرمائیں گے، کوئی تازہ خبر نہیں ہے کہ لکھی جائے۔

نمیقہ بندہ

عماد الملک سید حسین بلگرامی

۱۲ مئی ۱۹۲۵ء

مولانا مخدومنا محترمنا زیدت معالیہ وبرکت ایامہ ولیالہ

سلام علیکم والعھود بحالھا

وقد بلغ الاشواق حد کمالھا

اس مشہور شعر کا مدعا یہ ہے کہ اگر صحت مزاج اور دوسرے حالات اجازت دیتے تو میں ضرور دار المصنفین کی زیارت سے اور جناب والا کی ملاقات سے مشرف ہوتا، عنایت نامہ مورخہ ۱۶ ماہ حال انگریزی نے میرے دلی اشتیاق کو اور زیادہ کردیا۔

مزاج کی حالت ابھی تک بالکل صحیح اور درست نہیں ہے، بیماری کے دوران میں زندگانی دو چار روز سخت خطرہ کی حالت میں رہی، مگر بفضل خداوند تعالیٰ وہ حالت

بدل گئی، مگر ضعف و اضمحلال اب تک باقی ہے، کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں ہے، لکھنے پڑھنے کے لیے اجازت بہت قلیل ہے۔

اس حقیر نالائق کے ترجمہ کو جناب جس طرح مناسب سمجھیں کام میں لا سکتے ہیں، مگر اس قدر یاد رہے کہ ترجمہ معرض نظرثانی میں تھا جب بعض جسمانی اور روحانی ضرورتوں سے کام بند ہوگیا، اور اب تو حالت اور بدتر ہے، اعادہ ناممکن ہے، جس قدر اوراق طبع ہو چکے تھے، وہ جناب والا کے ملاحظہ کے لیے پیش کیے جاتے ہیں، ان کی نظرثانی کی سخت ضرورت ہے، مگر کیا کیا جائے۔

اس وقت تو مجھے یہ عریضہ تمام کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، اس کے خطیات کو جناب والا معاف فرمائیں گے، فقط

بندۂ ناچیز

سید حسین بلگرامی عماد الملک

بہترین مضامین پر عطیہ

حاجی وارث علی شاہ میموریل ٹرسٹ دیوہ شریف بارہ بنکی نے دو عنوانات پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی دعوت عام دی ہے، سب سے بہتر مقالہ پر انعام دیا جائے گا۔

پہلا مضمون حضرت حاجی سید وارث علی شاہ صاحب قبلہ کی حیات پاک تعلیمات و ارشادات پر لکھا جائے گا!

دوسرا مضمون دیوہ شریف کی روحانی اور علمی تاریخ پر ہوگا، دونوں میں آٹھ آٹھ ہزار الفاظ سے کم نہ ہونے چاہییں۔

اس سلسلہ میں ٹرسٹ کمیٹی کے مقرر کیے ہوئے ججوں کا فیصلہ آخری ہوگا، جن مضامین پر انعام دیا جائیگا وہ ٹرسٹ کمیٹی کی ملکیت ہونگے اور بقیہ کے واپسی کی ذمہ داری ٹرسٹ پر نہ ہوگی دونوں عنوانوں پر سب سے بہتر مضمون پر ڈھائی ڈھائی سو کے نقد انعامات دیئے جائیں گے، دیوہ شریف اگر معلومات حاصل کرنا چاہیں گے تو ان کے قیام کا انتظام ٹرسٹ کی طرف سے کیا جائیگا۔

مضامین بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۶ء ہے، اور رضی احمد صاحب آنریری منیجر حاجی وارث علی شاہ میموریل ٹرسٹ دیوہ شریف کے پاس داخل ہو جانی چاہیے، ڈاک سے بھیجنے والے مضامین رجسٹرڈ بھیجے جائیں تو مناسب ہوگا مضامین صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھے جائیں۔

مطبوعات جدیدہ

پیغمبر انسانیت کتابت و طباعت بہتر، ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ قیمت: عنہ

سیرت نبوی کے موضوع پر نصف صدی کے اندر چھوٹی بڑی سیکڑوں کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جن میں بعض صدیوں تک زندہ رہیں گی، مولانا جعفر شاہ صاحب نصف درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں، انھوں نے سیرت نبوی پر پیغمبر انسانیت کے نام سے یہ کتاب لکھی ہے، جو سیرت کی متوسط درجہ کی کتابوں میں ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے مصنف نے محض فضائل و مناقب کی روایتیں نقل کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ سیرت نبوی کے منبع انوار سے فکر و نظر اور عمل و کردار کو روشنی بخشنے کی کوشش کی ہے، محض واقعات نگاری کا فرض انجام نہیں دیا ہے، بلکہ خود اس سے تاثر لیا ہے، اور دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے، کہیں کہیں اخذ نتائج اور استدلال سے اختلاف کی گنجائش ہے، پھر بھی قلم جادۂ اعتدال سے ہٹا نہیں ہے، اگر واقعات کا حوالہ بھی دیدیا گیا ہوتا تو اس کی افادیت میں اعتماد کی کیفیت زیادہ پیدا ہو جاتی، یہ کتاب اس موضوع پر ایک اچھا اضافہ ہے۔

العقیدۃ السنیہ شرح العقیدۃ الحسنہ عربی از مولانا محمد اویس صاحب ندوی، صفحات ۔۔، ٹائپ عمدہ، ناشر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت: ۔ ۲ر

اسلامی عقائد میں کوئی فلسفیانہ پیچ وخم نہیں ہے، ان میں عقلیت کے ساتھ اتنی فطری سادگی ہے کہ اگر اس کے خلاف پہلے سے دل میں عناد نہ ہو تو وہ انسان کے ذہن میں بڑی آسانی سے بیٹھ جاتے ہیں، خاص طور پر خدا کی ذات وصفات کا عقیدہ، مگر مسلمانوں میں یونانی اور ہند وفلسفہ کے اثر سے اس میں طرح طرح کی موشگافیاں شروع ہوئیں، جن کی بنا پر متکلمین اسلام نے بہت سے نو مولود مسائل کی روشنی میں عقائد میں بہت سی احترازی قیدوں کا اضافہ کر دیا ہے، گو انھوں نے ایسا نیک نیتی سے کیا مگر پھر بھی اسلامی عقائد کی سادگی اس سے قدرے مجروح ہوئی، امام ابن تیمیہ امام ابن قیم، اور عزالدین بن عبد السلام وغیرہ نے اس پر تنقیدیں کی ہیں اور کتاب وسنت کی روشنی میں اسلامی عقائد کی وضاحت کی ہے، ہندوستان میں شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ العقیدۃ الحسنہ لکھا تھا، جسے ندوہ نے غالباً سب سے پہلے اس کو داخل نصاب کیا، العقیدۃ السنیہ شاہ صاحب کے اسی رسالہ کی شرح ہے، شارح یعنی مولانا محمد اویس صاحب ندوی نے شرح میں ان ائمہ کے خیالات کے ساتھ خود شاہ صاحب نے اپنی دوسری تصانیف میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے ان سب کو جمع کر دیا ہے، اس طرح یہ کتاب اس موضوع پر ایک جامع کتاب بن گئی ہے، کتاب اس قابل ہے کہ اسے داخل نصاب کر لیا جائے۔

مکتوبات عبد الحق مرتبہ جلیل احمد قدوائی، صفحات ۲۸۰، کتابت وطباعت متوسط

ناشر مکتبہ اسلوب کراچی ۱۸ قیمت: ۱۲

اردو میں ذاتی خطوط میں سب سے پہلے غالب کے خطوط کو ادبی حیثیت دی گئی، اور اس کے بعد شبلی اور اقبال کے خطوط کو ادبی اہمیت کے ساتھ علمی وفکری حیثیت حاصل ہوئی، مولانا ابو الکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا جاتا ہے، مگر ان کے زیادہ تر خطوط لکھے گئے ہیں، بھیجے نہیں گئے ہیں، یہ واقعی سے زیادہ تخیلی ہیں،

ڈاکٹر عبد الحق مرحوم اردو کے بڑے محسن ملکہ معماروں میں ہیں، انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی اور ان کے تعلقات ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں سے رہے، اسی لئے انھوں نے مختلف ذاتی، سیاسی ادبی اور علمی کاموں کے سلسلہ میں بیشمار خطوط لکھے تھے، تمام نجی خطوط کی اشاعت گو کوئی خوش گوار کام نہیں ہے، مگر اس دور کا فیشن ہو گیا ہے، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب اپنے خطوط کی اشاعت کے بارے میں اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں، "یہ بھی فیشن میں داخل ہو گیا ہے کہ ہر کس و ناکس کے خط جمع کر کے شائع کر دئے جاتے ہیں، اور غریب لکھنے والے کی خوب تشہیر کی جاتی ہے" (ص ۳۰۶) مگر جن خطوط کی واقعی کوئی ادبی، علمی یا سیاسی اہمیت ہو ان کی اشاعت سے طرح طرح کے فائدے بھی ہوتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خطوط بھی اس قابل تھے کہ ان کو شائع کیا جائے، ان سے ایک طرف ان کی شخصیت پورے طور پر سامنے آجاتی ہے، دوسری طرف اس دور کی ادبی اور علمی تحریکوں اور سیاسی رجحانات کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کن کن دقتوں اور مشکل حالات میں اردو کی خدمت کی ہے، ان میں گاندھی جی اور سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کے علاوہ ان کے بعض تلامذہ کے تلامذہ تک کے خطوط شامل ہیں، جلیل صاحب نے اسکو مرتب کر کے ایک اچھا کام انجام دیا ہے،

اردو ناول کی تنقیدی تاریخ از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی صفحات ۳۰۵، کتابت وطباعت بہتر،

ناشر ادارہ فروغ اردو امین آباد لکھنؤ، قیمت: ۸

داستان گوئی اور فسانہ نویسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ناول نگاری ہے، ہندوستان میں اس فن کو سب سے زیادہ ترقی انگریزوں کے دور میں ہوئی، اس زمانہ کی سب سے مشہور داستان میر امن کی چہار درویش ہے، میر امن کے بعد سرشار، شرر اور رسوا وغیرہ نے اس کو ترقی دی، مصنف نے قدیم داستانوں سے لیکر موجودہ دور تک کے ناولوں کا ایک تنقیدی جائزہ لیا ہے، کہیں کہیں ان کی رائیں انتہا پسندانہ معلوم ہوتی ہیں، مثلاً وہ پریم چند کے ناولوں کو ناول ہی تسلیم

کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، مگر پھر بھی انھوں نے چونکہ اس موضوع پر کافی محنت کی ہے، اور کئی کتابیں بھی لکھی ہیں، اس لئے اس بارے میں ان کی رائیں بے وزن نہیں ہیں۔

انتخابات اردو، صفحات ۲۶۰ کتابت و طباعت معمولی ناشر دو آرا اینڈ کمپنی پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی ۲ قیمت ۱ر عہ

اردو نثر و نظم کے جو مختلف منتخب مجموعے اسکولوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں ان میں انتخابات اردو بھی ہے، جسے گجرات سرٹیفکٹس اگزامیشن بورڈ نے مرتب کرایا ہے، نثر میں میر امن سے لیکر سندر ناتھ تک کے مضامین کا انتخاب شامل ہے، اسی طرح نظم میں ولی گجراتی سے لیکر آنند نرائن ملا تک کے کلام کے نمونے شامل ہیں، تعجب ہے کہ اردو کی سب سے قدیم صنف حمد و نعت کے نمونے اس میں شامل نہیں ہیں، منظومات میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کو نظر انداز کر دینا بھی تعجب خیز معلوم ہوا، یہ انتخاب مکمل تو نہیں کیا جا سکتا مگر مفید ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے۔

جماعت اسلامی کے نظریات و افکار از مولانا عبدالصمد رحمانی، صفحات ۵۶، کتابت اشاعت اعلیٰ ناشر دار التالیف مانڈر ضلع مونگیر

قیمت ۷۵ پیسے

جماعت اسلامی کے نظریات و افکار کے بارے میں پہلے بہت سے چھوٹے بڑے رسالے شائع ہو چکے ہیں، انہی میں یہ رسالہ بھی ہے، مگر اس تحریک "مودودیت" کی مہم سے نہ تو ان لوگوں کے خیال کے مطابق جماعت اسلامی کی اصلاح ہوئی اور نہ اس سے عام مسلمانوں کو کوئی تعمیری فائدہ پہنچا، اس کتاب میں جتنے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، ان سب کی تاویل و توجیہ ہو سکتی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا کہ مودودی صاحب کا قلم کہیں کہیں جادہ ادب سے ہٹ گیا ہے، مگر اس سے اس کے اصول و مقاصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور قابل بحث بھی یہی ہیں، کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت مودودی صاحب کی کتابوں سے اقتباسات جمع کر دئے گئے ہیں،

(م ج)

جلد ۹۳ - ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۶۴ء - عدد ۵

مضامین

مقالات

ادبیات علمیہ و ادبیہ